اب بلا اختلاف قدسی مشہدی کی نہیں سمجھی جاتی، اس سے قطع نظر یہ مجموعہ قلب و روح کی تازگی و بالیدگی کا سامان ہے۔

شعری ضرب الامثال مرتبہ جناب شمس بدایونی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۸۰ مع کور قیمت ۸ روپے پتہ:- روشن پبلیکیشنز، روشن محل، محلہ سوتھ، بدایوں یوپی

جناب شمس بدایونی شعر وسخن کا اچھا ذوق رکھتے ہیں، انھوں نے اس کتاب میں ان اشعار کا انتخاب شائع کیا ہے جن کے دونوں مصرعے یا ایک ہی مصرعہ عموماً زبان زد ہے یا جو اشعار ان کے خیال میں ضرب المثل کے طور پر استعمال ہونے کے لائق ہیں، انتخاب میں قدیم اساتذہ اور اس عہد کے بعض شعرا کا کلام بھی دیا گیا ہے، بہت سے اشعار اور مصرعے گو زبان زد ہوتے ہیں مگر ان کے کہنے والوں کے نام معلوم نہیں ہیں یا وہ دوسروں کی جانب منسوب ہو گئے ہیں، لائق مرتب نے حاشیے میں اس کی تردید کر کے اصل شاعر کا نام بتا دیا ہے مگر اس طرح کے بعض مختلف فیہ اشعار کا معاملہ محض مختصر حاشیہ سے حل نہیں ہو سکتا، بعض جگہ اس طرح کے حواشی غیر مدلل اور غیر اطمینان بخش ہیں جیسے ص۴۴ پر شاد عظیم آبادی کا ایک شعر نقل کر کے لکھا ہے کہ "پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اپنی تصنیف "ہماری شاعری" میں اس شعر کو شاد لکھنوی سے نہ معلوم کس بنا پر منسوب کیا ہے" اولاً تو ہمارے پیش نظر اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ہے اس میں شعر کی نسبت کسی شاعر کی جانب نہیں کی گئی ہے ثانیاً یہ اور اس طرح کے دوسرے حواشی سے ظاہر نہیں ہوتا کہ کیوں دوسرے کا خیال بلا تحقیق اور مصنف کا خیال مدلل ہے تاہم مصنف کی محنت قدردانی کے لائق ہے۔

"ض"

جلد ۱۴۲ ماہ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۸۸ء عدد ۴

مضامین

مقالات

تلخیص وتبصرہ

آثار علمیہ وادبیہ

معارف کی ڈاک:

ادبیات

شذرات

اسلام نے مسلمانوں کو دوسری قوموں کے ساتھ فراخدلی، رواداری اور بے تعصبی کے ساتھ پیش آنے کی تعلیم دی ہے، دوسرے مذاہب کے معاملہ میں اس کا نقطۂ نظر ہمیشہ وسعتِ نظر اور کشادہ دلی کا رہا ہے، اس اعتبار سے وہ دنیا کے تمام مذہبوں سے علانیہ ممتاز ہے، عیسائیوں نے اسلام کو سب سے زیادہ بدنام کیا ہے، مگر خود عیسائیت کی تاریخ کے صفحات خون سے رنگین ہیں، اسلام نے دین کی دعوت دینے کے لیے تلقین و ترغیب، حکمت و دانائی اور پند و موعظت کا طریقہ اختیار کیا ہے، اور جبر و اکراہ کو ناپسند کیا ہے، اس کے نزدیک اسلام صرف زبان سے اقرار کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ دل سے بھی اس پر یقین و اذعان ضروری ہے، تشدد اور قوت سے زبان سے تو اقرار کرایا جاسکتا ہے مگر دل میں یقین نہیں پیدا کیا جاسکتا۔

اسی کے ساتھ ہی اس نے مسلمانوں کو اس کی بھی ہدایت کی ہے کہ وہ اسلام کی صراط مستقیم پر ہر حال میں مضبوطی سے قائم رہیں، اور اپنے عقیدہ و مذہب پر پوری استقامت کے ساتھ جمے رہیں، کسی خوف دباؤ، دھمکی اور لالچ میں آکر نہ ان کے قدم میں لغزش اور تزلزل پیدا ہو اور نہ مذہب و اعتقاد کے بارے میں وہ کوئی سمجھوتا اور مفاہمت کریں، رواداری کا مطلب مداہنت، عقیدہ کی کمزوری اور اصول کے معاملہ میں لچک اور نرمی نہیں ہے، مولانا ابوالکلام آزاد کے بقول "اسلام کی تیرہ سو برس کی جو شاندار روایتیں مسلمانوں کے ورثہ میں آئی ہیں ان کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع نہ ہونے دیں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب ان کی دولت کا سرمایہ ہے اسکی حفاظت انکا فرض ہے"۔ رواداری کے نتیجہ میں نہ خود ایسی کوئی کتربیونت کریں اور نہ دوسروں کی مداخلت برداشت کریں۔

دنیا میں فکر و عمل کی راہیں ہمیشہ سے مختلف رہی ہیں، نہ تو کبھی تمام لوگ ایک ہی مسلک و خیال پر متفق ہوئے ہیں اور نہ آیندہ ہوں گے، ایک ہی مسئلہ میں مکمل غور و فکر کے بعد ہم جس

نتیجہ تک پہونچتے ہیں، دوسرا شخص بعینہٖ اسی مسئلہ میں ہم سے بالکل مختلف رویہ اختیار کرتا ہے، ایک حقیقت ہم پر روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے، لیکن دوسرے لوگ اس کے بارے میں شک و تذبذب اور بے یقینی کا شکار ہوتے ہیں، کسی خاص عقیدہ و نظریہ کی صحت و صداقت ہم پر بالکل واضح ہوتی ہے، مگر دوسرا آدمی اس کے متعلق ہم سے بالکل مختلف رائے رکھتا ہے، ایسی صورت میں ہم جس نتیجہ تک پہونچے ہیں اس پر اپنے کو مضبوطی سے قائم و استوار رکھیں، مگر دوسرے کو بھی اس کی رائے پر قائم رہنے دیں اور اسے زبردستی اپنی راہ پر چلنے کے لیے مجبور نہ کریں، خواہ اس کی روش ہمارے نزدیک صراحۃً غلط ہی کیوں نہ ہو، رواداری کا اقتضا اسی قدر ہے، اس سے آگے بڑھ کر دوسرے نقطۂ نظر سے مفاہمت اور سمجھوتا کرنا اور اپنے اصول و نظریات سے دستبردار ہو کر برسر اقتدار گروہ کے رنگ میں رنگ جانا فکری و اعتقادی کمزوری ہے، دوسروں کے عقائد کا احترام جس قدر ضروری ہے اس سے زیادہ یہ ضروری ہے کہ اپنے عقیدہ و عمل کو کمزوری کے حوالہ نہ کیا جائے۔

رواداری اور مفاہمت کی خوبی مسلم ہے مگر عقیدہ کی مضبوطی، رائے کی پختگی اور فکر کی استقامت کی خوبی سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا، دونوں کے اپنے اپنے حدود اور دائرے ہیں، اور ان کی خوبیاں ان سے اس وقت تک پیوستہ رہتی ہیں جب تک یہ اپنے حدود کے اندر ہوں، حد سے تجاوز کے بعد ہر چیز کی طرح یہ بھی اپنی خوبی کھو دیتی ہے، عفو و درگذر بڑی اچھی چیز ہے لیکن جب یہ اپنی حدبندی کے خط کو پار کر جائے تو بزدلی اور بے ہمتی کہلاتی ہے، شجاعت انسانی سیرت کا ایک بڑا وصف ہے لیکن اپنی حد سے گذرنے کے بعد یہ قہر و غضب اور ظلم و تشدد ہو جاتا ہے، رواداری بھی اپنی حد سے بڑھ جانے کے بعد اعتقاد کی کمزوری، یقین کا فقدان اور استقامتِ فکر کی نفی بن جاتی ہے، اس بنا پر اس میں حد اور دائرے کا لحاظ بہت ضروری ہے، حد میں رہنے سے نہ عقیدہ پر کوئی آنچ آئے گی، اور نہ فکر و اعتقاد کی پختگی سے رواداری کے تقاضے فراموش ہوں گے، بدقسمتی سے اس وقت حدبندی ختم ہوگئی ہے،

اور وہ لوگ افراط و تفریط میں پڑ گئے ہیں، ایک طرف عقیدہ کی مضبوطی نے دوسروں کے اعتقاد و عمل میں جبراً مداخلت شروع کردی ہے، دوسری طرف رواداری نے فکر و عمل کی استقامت ختم کرکے عقیدہ میں لچک پیدا کردی ہے۔

جناب عبدالرحمن خان نشتر کی وفات نے پورے اترپردیش کو سوگوار بنا دیا ہے، وہ اس صوبہ کے ایک مقبول اور ہر دلعزیز لیڈر تھے، ان پر دو بار دل کی بیماری کا حملہ ہوچکا تھا، ۷ اکتوبر کو بریلی کے ایک مشاعرہ میں نعتیہ کلام سماعت فرما رہے تھے کہ پھر حملہ ہوا اور جاں بحق ہوگئے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، انھوں نے پہلے کانپور میں تجارت شروع کی، پھر قوم و وطن کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کردی، وہ کانگریس پارٹی کے سرگرم اور مخلص کارکن تھے، مختلف تنظیمی عہدوں پر فائز رہنے کے علاوہ وزیر بھی رہے، اقلیتوں کے مسائل اور قومی یکجہتی کے پروگرام سے دلچسپی کی بنا پر کانگریس کے اقلیتی سیل کے صدر اور ریاستی قومی یکجہتی کونسل کے نائب صدر مقرر کیے گئے، جو بھی عہدہ اور ذمہ داری انھیں سپرد کی جاتی اسے محنت، قابلیت اور دیانت داری سے انجام دیتے، اور نیک نامی حاصل کرتے۔

نشتر صاحب ایک خوش عقیدہ مسلمان اور بزرگان دین کے بڑے معتقد تھے، مزاروں پر بھی حاضری دیتے، صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے، تلاوتِ قرآن میں ناغہ نہ کرتے، حج کا فریضہ بھی ادا کیا تھا، گذشتہ سال لکھنؤ کی تقدس حج کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے انھوں نے جو پُرمغز اور دلنشین تقریر کی اس سے لوگ بہت متاثر ہوئے، اس سے ان کی گہری مذہبیت کا بھی اندازہ ہوا، مسلمانوں کے مخصوص مسائل سے بھی دلچسپی لیتے، اور اس کے لیے جرأت و بے باکی سے آواز بلند کرتے، وہ اپنی نیکی، شرافت، وضعداری اور انسانیت دوستی کی وجہ سے ہر طبقہ میں مقبول تھے، دوسروں کی مدد کرکے خوش ہوتے، بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود عوام سے بھی برابر رابطہ قائم رکھتے، راقم سے ملاقات ہوتی تو بڑے تپاک سے ملتے اور شفقت فرماتے، دارالمصنفین کے بڑے خیرخواہ اور قدردان تھے، جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب مرحوم کی وفات کے بعد تعزیت کے لیے یہاں تشریف لاکر بڑے اخلاص اور گہرے تعلق کا ثبوت دیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔

مقالات

عہد نبویؐ کی چند یادگار تحریریں

از

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری سابق ایڈیٹر البلاغ، بمبئی

عہد نبویؐ میں اگرچہ دیوان الانشاء کا باقاعدہ قیام نہیں ہوا تھا، مگر تمام چھوٹے بڑے اہم معاملات تحریری شکل میں انجام پاتے تھے، اور ان تحریروں کو محفوظ رکھا جاتا تھا، اس کام کیلئے عام کاتبوں کے علاوہ چند مخصوص کاتب مقرر تھے، جو مفوضہ خدمات کو بحسن و خوبی انجام دیتے تھے، جہشیاری نے کتاب الوزراء والکتاب میں "اسماء من ثبت علی کتابۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے عنوان سے ان کے نام اور ان سے متعلق شعبۂ کتابت کو تفصیل سے بیان کیا ہے[1]۔

عہد نبویؐ کی تحریروں کی اہمیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کاتبوں سے وحی کے علاوہ عہد نامے، صلح نامے، دعوت نامے، قطائع نامے اور اسی طرح کے دوسرے تمسکات املا کراتے تھے، پھر ان کو سن کر ان کی تصدیق و توثیق فرماتے تھے، اس لیے ایسی تمام تحریریں وحی الٰہی کے بعد بڑی اہمیت رکھتی ہیں، اور ان کے مستند و معتبر ہونے میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہے، انکی صحت و اہمیت کا اندازہ امام محمد بن سیرین متوفی سنہ ۱۱۰ھ کے اس قول سے ہوتا ہے:

لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا كِتَابًا لَاتَّخَذْتُ ... اگر میں احادیث کو کتابی شکل میں جمع

---

[1] کتاب الوزراء والکتاب: ورق ۲ (طبع ویانا)

رسائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم [1]

کرتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط و رسائل کو ضرور جمع کرتا۔

امام ابن سیرینؒ حفظ حدیث کے مقابلہ میں کتابت حدیث کے حق میں نہیں تھے، ان تحریروں میں بہت اسی بعد میں کئی صدیوں تک محفوظ و موجود رہیں، اور جب احادیث اور سیر و مغازی کی تدوین کا دور آیا تو ان سے کام لیا گیا، بلکہ آج تک ایسی تحریریں موجود ہیں، خاص طور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوتی مکتوبات مختلف مقامات میں محفوظ ہیں، اس وقت ہم عہد نبویؐ کی چند ایسی یادگار تحریروں کی نشان دہی کر رہے ہیں جو مختلف قبائل اور افراد کے پاس خاندان در خاندان محفوظ رہیں، اور احادیث کی تدوین، خاص طور سے سیر و مغازی کی تدوین کے لیے ابتدائی تحریری سرمایہ میں بڑی اہم ثابت ہوئیں۔

امام ابوجعفر باقرؒ کے پاس صحیفۂ نبویؐ

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے ابوجعفر محمد الباقر متوفی ۱۱۸ھ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک صحیفہ تھا جو آپ کی تلوار کے قبضہ میں پایا گیا تھا، وہ کہتے ہیں:

وُجِدَ فِی قَائِمِ سَیْفِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَحِیْفَۃٌ فِیْھَا مَکْتُوْبٌ [2] الخ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار کے قبضہ میں ایک صحیفہ پایا گیا جس میں لکھا تھا کہ الخ

دعوتی مکتوب عمیر ذو مرّان کے نام

مغازی کے مشہور عالم مجالد بن سعید بن عمیر ہمدانی کوفی متوفی ۱۴۴ھ کے دادا عمیر ذو مرّان ہمدانی کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتی مکتوب روانہ فرمایا تھا، جو قبیلۂ بنو ہمدان میں محفوظ تھا، اور مجالد بن سعید نے اس کی زیارت

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۱۹۴ (بیروت) [2] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۷۱۔

کی تھی، ان کا بیان ہے:

کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی جدی عندنا [1]

میرے دادا کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب ہمارے پاس موجود ہے۔

عامر بن ہلال تمیمی کے نام نامۂ مبارک

قبیلہ بنو عیسیٰ بن جبیب کے ایک سردار ابو سیارہ عامر بن ہلال تمیمی کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نامۂ مبارک بھیجا، جو ان کے خاندان میں موجود تھا، ابن ابی حاتم کا بیان ہے:

والکتاب عند بنی عمہ المتعیین [2]

یہ مکتوب عامر بن ہلال کے چچا کے لڑکوں کے پاس بنو تمیم میں موجود ہے۔

جابر بن ظالم طائی کے نام ایک تحریر

قبیلہ بنو طے کے جابر بن ظالم خدمت نبویؐ میں حاضر ہو کر مسلمان ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک تحریر عنایت فرمائی جو ان کے خاندان میں محفوظ تھی۔

وکتب لہ کتابا ھو عند اھلہ بالجبلین [3]

آپ نے ان کے لیے ایک تحریر لکھی جو بنو طے کے پاس اجار اور سلمیٰ دونوں پہاڑوں میں موجود ہے۔

ابن حجر اور سمعانی نے بھی اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

وفد الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وکتب لہ کتابا فھو عندھم [4]

جابر بن ظالم خدمت نبویؐ میں حاضر ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک تحریر دی جو ان کے خاندان میں موجود ہے۔

---

[1] المعارف ابن قتیبہ ص ۱۴۳ [2] کتاب الجرح والتعدیل ج ۳ ق ۱ ص ۳۲۸ [3] طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۲۸۰۔
[4] اصابہ ج ۶ ص ۳۲۱ والانساب ج ۹ ص ۳۹۹۔

سعیر بن عداء قریعی کے نام مکتوب

سعیر بن عداء، قریعی کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مکتوب بھیجا تھا، یہ مکتوب ان کی اولاد نے بحفاظت رکھا، عبداللہ بن یحییٰ ابن سلیمان نے اس کو دیکھا تھا، ان کا بیان ہے:

ارانی ابن لسعیر بن عداء	سعیر بن عداء کے لڑکے نے مجھے رسول اللہ
کتابا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[1]	صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب دکھایا۔

قبیلہ بنی عقیل کے نام ایک تحریر

قبیلہ بنی عقیل بن کعب کے تین افراد ربیع بن معاویہؓ، مطرف بن عبداللہ اور انسؓ بن قیس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر اسلام لائے اور اپنے قبیلہ کی طرف سے آپ کے دست اقدس پر بیعت کی، آپ نے ان کو بنی عقیل کا علاقہ عقیق عطا فرمایا، اور اس کے لیے سرخ چمڑے پر ایک تحریر لکھ دی:

فکان الکتاب فی ید مطرف[2]	یہ مکتوب مطرف بن عبداللہ کے پاس تھا،

اس مکتوب کا پورا متن طبقات ابن سعد میں منقول ہے۔

ایک بدوی کے نام ایک تحریر

جہضم بن ضحاک کا بیان ہے کہ مجھ کو بادیہ میں ایک شخص ملا، اس نے بتایا کہ میں نے بچپن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے، آپ نہایت حسین و جمیل تھے، پھر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تحریر دکھائی جو اس کے چچا کی جاگیر سے متعلق تھی:

فاخرج الینا کتابا فاذا	اس نے ہمارے سامنے ایک مکتوب
فیہ ھذا ما اقطع النبی	پیش کیا جس میں تھا کہ یہ جاگیر اس کے
صلی اللہ علیہ وسلم فلان	چچا فلاں بن فلاں کو رسول اللہ صلی اللہ
بن فلان یعنی عمہ[3]	علیہ وسلم نے عنایت کی ہے۔

[1] طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۲۰۲۔ [2] ایضاً ص ۳۰۲۔ [3] تاریخ کبیر ج ۱ قسم ۱ ص ۲۳۲۔

رقاد بن عمرو کے نام ایک تحریر

قبیلہ جعد بن کعب سے رقاد بن عمرو خدمت نبویؐ میں آئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مقام فلج میں ایک جاگیر عطا فرما کر اس کے بارے میں تحریر لکھ دی جو ان کے خاندان میں محفوظ تھی:

واعطاہ رسول اللہ صلی اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو
علیہ وسلم بالفلج ضیعۃ	مقام فلج میں ایک جائداد دے کر
وکتب لہ کتابا، وھو	ایک تحریر دے دی، جو قبیلہ جعد بن
عندھم[1]	کعب کے پاس موجود ہے۔

بنی زہیر بن اقیش کے نام مکتوب

قبیلہ عکل کی شاخ بنی زہیر بن اقیش سے نمر بن تولب شاعر نے خدمت نبویؐ میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ذریعہ بنو زہیر بن اقیش کو ایک مکتوب روانہ فرمایا جو اس قبیلہ کے پاس موجود تھا، ابوالعلاء یزید ابن عبداللہ بن شخیر بصری متوفی [illegible]ء کا بیان ہے:

اتانا رجل من عکل ومعہ	ہمارے یہاں قبیلہ عکل کا ایک شخص آیا
کتاب من رسول اللہ	جس کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
صلی اللہ علیہ وسلم فی	کا ایک مکتوب چمڑے کے ٹکڑے میں
قطعۃ جراب کتبہ لھم	تھا جس کو آپ نے بنو زہیر بن اقیش کیلئے
من محمد رسول اللہ الی بنی	یوں لکھا تھا: محمد رسول اللہ کی طرف سے
زھیر بن اقیش الخ[2]	بنی زہیر بن اقیش کے نام الخ

بنی زہیر بن اقیش کے اس مکتوب نبویؐ کا ذکر متعدد کتابوں میں معمولی فرق کے ساتھ موجود ہے۔

[1] طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۳۰۲۔ [2] ایضاً ج ۷ ص ۳۹۔

المنتقیٰ لابن جارود اور جمع الفوائد میں یزید بن عبداللہ بن شخیر کا بیان ہے کہ ہم لوگ بصرہ کے مقام مربد میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے، ہمارے پاس ایک اعرابی آیا جس کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک ٹکڑا تھا، اس نے بتایا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر ہے، میں نے یہ تحریر لے کر اپنے ساتھیوں کو سنایا، اس کی ابتدا یوں تھی:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، ھٰذا	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، یہ تحریر محمد
کتاب من محمد رسول اللہ لبنی	رسول اللہ کی طرف سے بنی زہیر بن اقیش
زھیر بن اقیش الخ	کے لیے ہے، الخ

ہم نے اس اعرابی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرنے کو کہا، تو اس نے ایک حدیث بیان کی، میں نے پوچھا کہ یہ حدیث آپ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے؟ اس نے کہا کہ کیا تم لوگ سمجھتے ہو کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جھوٹ بولوں گا؟ یہ کہہ کر وہ ہمارے ہاتھ سے مکتوب لے کر چلا گیا۔[1]

اور ابو عبید قاسم بن سلام نے کتاب الاموال میں یزید بن عبداللہ بن شخیر سے یوں روایت کی ہے کہ ہم لوگ مقام مربد میں تھے، مطرف بھی ہمارے ساتھ تھے، ایک اعرابی آیا جس کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک ٹکڑا تھا، اس نے ہم سے پوچھا کہ تم لوگوں میں کوئی پڑھنا جانتا ہے؟ ہم نے کہا: ہاں! تو اس نے وہ ٹکڑا ہم کو دیا جس میں لکھا ہوا تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
من محمد رسول اللہ صلی اللہ	محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف
علیہ وسلم لبنی زھیر بن اقیش	سے عکل کے بنی زہیر بن اقیش کے لیے

[1] المنتقیٰ لابن جارود ص ۲۷۰، جمع الفوائد ج ۲ ص ۲۸۔

من عکل، انکم ان شھدتم	اگر تم لا الٰہ الا اللہ کی گواہی دوگے اور
ان لا الٰہ الا اللہ واقمتم	نماز پڑھوگے اور زکوٰۃ ادا کروگے اور
الصلوٰۃ، وآتیتم الزکوٰۃ، و	مشرکوں سے ترک تعلق کروگے، اور
فارقتم المشرکین واعطیتم	مال غنیمت میں سے خمس اور رسول اللہ
من المغانم الخمس وسھم	صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص حصہ دوگے
النبی صلی اللہ علیہ وسلم والصفی	تو اللہ و رسول کی طرف سے امن و امان
او قال وصفیۃ فانتم آمنون	میں رہوگے۔
بامان اللہ ورسولہ۔[1]	...

عداء بن خالد کے نام تحریر: عداء بن خالد بن ہوذہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے ان کو پانی کا ایک چشمہ جاگیر میں دے کر اس کی ملکیت و تولیت کے بارے میں تحریری ثبوت دیا جس کو وہ بحفاظت رکھتے تھے، اور ادھر سے گذرنے والوں کو اس کی زیارت کراتے تھے، عبدالمجید بن ابو یزید وہب کا بیان ہے کہ میں اور حجر بن ابو نصر مکہ مکرمہ کے ارادہ سے نکلے، راستہ میں زُخیخ نامی ایک چشمہ پر پہونچے تو معلوم ہوا کہ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے والے ایک بزرگ ہیں، ہم نے جا کر ان سے پوچھا کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا، اور آپ کی تحریر دکھائی، ابن سعد نے لکھا ہے:

فقال نعم! وکتب لی بھٰذا	انھوں نے یہ کہہ کر کہ رسول اللہ صلی اللہ
الماء، قال: فاخرج جلدۃ	علیہ وسلم نے اس چشمہ کے متعلق یہ لکھا ہے

[1] کتاب الاموال ص ۱۱ - ۱۲۔

فیہا کتاب رسول اللہ صلی	ایک کھال نکالی جس میں رسول اللہ
اللہ علیہ وسلم[1]	صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر تھی۔

عباس سلمی کے نام تحریر عباس سلمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مقام دثینہ میں ایک کنواں جاگیر میں طلب کیا، آپؐ نے ان کی خواہش پوری کرکے ایک تحریر دے دی جو ان کے پوتے نائل بن مطرف کے پاس محفوظ تھی، وہ مقام دثینہ میں قیام پذیر اور وہاں کے باشندوں کے امیر تھے، ابوالازہر نے اس تحریر کی زیارت کی تھی، ان کا بیان ہے:

فاخرج الی حقۃ فیہا کراع	نائل بن مطرف نے ہمارے سامنے
من ادم احمر فکان فیہ	ایک ڈبہ نکالا جس میں سرخ چمڑے پر
ما اقطعہ[2]	اس جاگیر کے بارے میں تحریر تھی۔

بنی شیبان کے ایک شخص کے نام تحریر قبیلہ بنی شیبان کے ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ مجھے حیرہ کے حاکم بقیلہ کی صاحبزادی کے بارے میں ایک تحریر عنایت فرمادیں، آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم کو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ حیرہ پر فتح دے گا؟ اس نے کہا کہ اس ذات کی قسم ہے جس نے آپ کو حق دے کر مبعوث کیا ہے، حیرہ کو ہم فتح کریں گے، اسکے بعد آپؐ نے سرخ چمڑے پر ایک تحریر دے دی جس کو اس شیبانی صحابی نے بحفاظت اپنے پاس رکھا اور جب عہد صدیقی میں حضرت خالد بن ولیدؓ کی شامی فتوحات کے سلسلہ میں اہل حیرہ سے صلح ہوئی جس میں وہ شیبانی صحابی بھی شریک تھے تو انھوں نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو وہ تحریر دکھائی اور حاکم حیرہ بقیلہ کی صاحبزادی ان کو مل گئی، کتاب الاموال میں ہے:

فجاء الشیبانی بکتاب رسول اللہ	وہ شیبانی خالد بن ولید کے پاس

[1] طبقات ابن سعد ج ۷، ص ۵۲　[2] ایضاً ج ۷، ص ۷۶۔

صلی اللہ علیہ وسلم الی خالد	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب
بن ولید، فلما اخذہ قبلہ ثم	لائے، خالد بن ولیدؓ نے اس کو لے کر
قال دونکہا الخ[1]	بوسہ دیا اور کہا کہ تم بقیلہ کی بیٹی کو لے لو،

ہلال بن حارث مزنی کے نام مکتوب ہلال بن حارث مزنیؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قطعۂ زمین جاگیر میں دے کر تحریر لکھ دی، بعد میں ان کی اولاد نے وہ زمین حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کے ہاتھ فروخت کردی، اس میں دو عدد دکانیں تھیں، ہلال بن حارث کی اولاد نے کہا کہ ہم نے زمین فروخت کی ہے، دکانیں فروخت نہیں کی ہیں، اس کے بعد راوی کا بیان ہے کہ:

وجاءوا بکتاب القطعۃ التی	ہلال بن حارث کی اولاد رسول اللہ
قطعہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ	صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب لائی، جو
وسلم لابیہم فی جریدۃ	ان کے باپ کے نام ایک شاخ پر
قال فجعل عمر یمسحہا	تھا، عمر بن عبدالعزیزؓ نے اس کو بار بار
علی عینیہ، وقال لقیمہ	اپنی دونوں آنکھوں سے لگایا اور اپنے
انظر ما استخرجت منہا	کارندے سے کہا کہ تم دیکھو اس جاگیر
وما انفقت علیہا فقاضہم	سے کتنی آمدنی ہوئی ہے اور اس پر کتنا
بالنفقۃ و رد علیہم	خرچ ہوا ہے، خرچ کا حساب کرکے
الفضل۔[2]	فاضل آمدنی ان کو لوٹا دو۔

بسر بن سفیان خزاعی کے نام مکتوب بسر بن سفیان خزاعیؓ اپنے قبیلہ کے سردار تھے، ۶ھ میں

[1] کتاب الاموال ص ۱۸۲۔ [2] ایضاً ص ۳۳۸۔

مسلمان ہوئے، اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک تحریر دی جو ان کے خاندان میں مدتوں محفوظ رہی، زکریا ابن ابو زائدہ کا بیان ہے کہ میں ابو اسحاق سبیعی کے ہمراہ مکہ اور مدینہ کے درمیان جا رہا تھا، بنو خزاعہ کا ایک آدمی بھی ہمارے ساتھ ہو گیا، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مکتوب ہمارے سامنے پیش کیا جو بنو خزاعہ کے نام تھا اس کی ابتدا یوں تھی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد رسول اللہ
من محمد رسول اللہ الی	کی طرف سے بدیل بن ورقاء اور بسر
بدیل بن ورقاء و بسر و سروات	اور بنی عمرو کے سرداروں کے نام
بنی عمرو۔[1]	

دومۃ الجندل کے باشندوں کے نام مکتوب

دومۃ الجندل کے باشندوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دستاویز عنایت فرمائی تھی، جو تیسری صدی تک ان کے پاس محفوظ تھی، ابو عبید قاسم ابن سلام متوفی ۲۲۴ھ نے اس کی زیارت کی تھی، اور اسے اپنی کتاب الاموال میں حرف بحرف نقل کیا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ:

قال ابو عبید: اما ھذا	میں نے اس مکتوب کا اصل نسخہ پڑھا ہے
الکتاب فانا قرأت نسختہ	دومۃ الجندل کا ایک بوڑھا آدمی میرے
واتانی بہ شیخ ھناک مکتوبا	پاس اس کو لایا تھا، سفید چمڑے پر لکھا
فی قضیم صحیفۃ بیضا فنسختہ	ہوا تھا، اور میں نے اس کو حرف بحرف
حرفا بحرف، فاذا فیہ الخ[2]	نقل کر لیا، اس میں تھا کہ الخ

[1] تاریخ کبیر ج ا قسم ا ص ۲۷۶، اصابہ ج ا ص ۱۵۴ [2] کتاب الاموال ص ۱۹۴ و ۱۹۵۔

ایلہ، اذرح اور مقنا والوں کے نام ایک تحریر

سنہ ۹ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملک شام کے علاقے ایلہ، اذرح، مقنا اور جرباء کی طرف توجہ فرمائی، اور انکے باشندوں سے صلح کر کے تحریر دے دی، اہل مقنا کی یہ تحریر تیسری صدی میں ابو الحسن بلاذری متوفی سنہ ۲۷۹ھ کے ایک معاصر عالم نے دیکھی تھی اور ان کی روایت سے بلاذری نے فتوح البلدان میں نقل کی، ان کا بیان ہے:

واخبرنی بعض اھل مصر انہ	مصر کے بعض اہل علم نے مجھے بتایا
رأی کتابھم بعینہ فی جلد احمر	کہ انھوں نے اہل مقنا کے بارے میں
دارس الخط، فنسخہ واملی	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل تحریر
علیّ، نسختہ بسم اللہ	دیکھی ہے، جو سرخ چمڑے پر تھی، اس کا
الرحمن الرحیم من	خط مٹا ہوا تھا، انھوں نے اس کو نقل
محمد رسول اللہ الی	کر لیا اور مجھے دکھایا جو اس طرح ہے
ابن حبیبۃ، واھل	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، محمد رسول اللہ
مقنا۔[1]	کی طرف سے ابن حبیبہ اور اہل مقنا
	کے نام الخ۔

اہل نجران کے نام مکتوب

نجران کے عیسائی وفد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو صلح نامہ عنایت فرمایا تھا، یہ ان کے پاس مدتوں محفوظ رہا، اور وہ بار بار اس سے کام لیتے تھے، حسن بن صالح متوفی سنہ ۱۶۹ھ نے اس کو بچشم خود دیکھا تھا، اور ان کی روایت سے ان کے شاگرد کتاب الخراج کے مصنف یحییٰ بن آدم قرشی متوفی سنہ ۲۰۳ھ نے اس کا ذکر کیا ہے، بلاذری نے لکھا ہے:

[1] فتوح البلدان ص ۷۱۔

يحيیٰ بن آدم قال: اخذت	یحییٰ بن آدم نے کہا ہے کہ نجران والوں
نسخة كتاب رسول الله صلی الله	کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
عليه وسلم لاهل نجران من	مکتوب کا نسخہ میں نے ایک آدمی کی کتاب
كتاب رجل عن الحسن بن صالح	سے لیا ہے، جس کو اس نے حسن بن صالح
رحمه الله، وهي بسم الله الرحمٰن	سے روایت کیا ہے، وہ اس طرح
الرحيم، هذا ما كتب النبي	ہے، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم محمد رسول اللہ
رسول الله محمد للنجران الخ	کی یہ تحریر اہل نجران کے لیے ہے الخ۔

اس کے بعد خود یحییٰ بن آدم کا بیان نقل کیا ہے:

قال يحيیٰ بن آدم: وقد	میں نے نجرانیوں کے ہاتھ میں ایک
رأيت كتاباً في ايدي النجرانيين	مکتوب دیکھا ہے جس کا نسخہ اسی نسخہ کے
كانت نسخته شبيهة بهذه	مشابہ تھا، اور اس کے نیچے "کتب
النسخة، وفي اسفله "وكتب	علی بن ابی طالب" لکھا تھا، میں
علي بن ابي طالب" ولا ادري	نہیں سمجھتا کہ اس مکتوب کے بارے
ما اقول فيه۔[1]	میں کیا کہوں۔

خلافت فاروقی میں اہل نجران نے شرائط صلح کی خلاف ورزی کر کے آپس میں سود کا لین دین شروع کر دیا تو حضرت عمرؓ نے ان کو نجران سے جلاوطن کر کے کوفہ کے قریب مقام نجرانیہ میں بھیج دیا، اور ایک تحریر دے دی، حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں اہل نجران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمرؓ کی تحریریں لے کر ان کے پاس آئے، حضرت عثمانؓ نے امیر کوفہ

[1] فتوح البلدان ص ۷۶۔

ولید بن عقبہ ابن ابو معیط کو لکھا کہ اہل نجران نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمرؓ کی تحریریں مجھے دکھائی ہیں، تم ان کے معاملات کی تحقیق کرو۔

حضرت علیؓ کے دور خلافت میں نجرانیوں نے حضرت عمرؓ کے حکم کے خلاف ان سے ایک تحریر چاہی تو حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ حضرت عمرؓ معاملہ فہم تھے، میں ان کے خلاف نہیں کرنا چاہتا۔[1]

قاضی ابو یوسفؒ نے بھی کتاب الخراج میں یہ واقعات بیان کیے ہیں اور لکھا ہے:

وأتی اسقف نجران علياً	حضرت علیؓ کے پاس نجران کا راہب
رضی الله عنه ومعه كتاب في اديم احمر	سرخ چمڑے پر ایک مکتوب لے کر آیا۔

اور حضرت علیؓ نے اہل نجران سے فرمایا:

انكم اتيتموني بكتاب من	تم لوگ میرے پاس رسول اللہ
نبي الله صلی الله عليه وسلم	صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب لے کر
فيه شرط على	آئے ہو، جس میں تم پر شرط عائد
انفسكم۔[2]	کی گئی ہے۔

معاذ بن جبلؓ کے نام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجا، تو انھیں ایک تحریر دی، جس میں عشر کے بارے میں تفصیل درج تھی، یہ تحریر مشہور تابعی و فقیہ موسیٰ بن طلحہ قرشی مدنیؒ نزیل کوفہ متوفی ۱۰۳ھ کے پاس محفوظ تھی، قاضی ابو یوسف کا بیان ہے کہ موسیٰ بن طلحہؓ صرف گندم، جو، انگور اور کشمش میں عشر کے قائل تھے، ان کا کہنا تھا کہ

قال عندنا كتاب كتبه	ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا

[1] فتوح البلدان ص ۸۰۔ [2] کتاب الخراج ص ۸۵ تا ۸۹۔

النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم	مکتوب ہے جس کو آپ نے حضرت
لمعاذ، اوقال نسخة، او	معاذؓ کے لیے لکھا تھا، یا یہ کہا کہ اس
وجدت نسخته هكذا[1]	نسخہ میں میں نے ویسا ہی پایا ہے۔

بلاذری نے بھی اس کا ذکر کیا ہے:

قال قرأت كتاب	موسیٰ بن طلحہ نے کہا ہے کہ میں نے
معاذ بن جبل حين	معاذ بن جبلؓ کے نام رسول اللہ صلی اللہ
بعثه رسول الله صلى	علیہ وسلم کا وہ مکتوب پڑھا ہے، جس کو
الله عليه وسلم الى اليمن	آپؐ نے ان کو یمن بھیجنے کے وقت
فكان فيه[2] الخ۔	لکھا تھا۔

اہل طائف کے نام تحریر: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل طائف کو جو تحریر دی تھی، وہ آٹھویں صدی تک وہاں محفوظ تھی، حتیٰ کہ سنہ ۸۱۳ھ میں امیر مکہ قتادہ بن ادریس نے طائف پر حملہ کیا، اور اس کی فوجوں کی لوٹ مار میں یہ تحریر ضایع ہوگئی، تقی الدین فاسی مکی نے لکھا ہے:

ان فی هذه الوقعة فقد	جب قتادہ کی فوجوں نے شہر میں لوٹ
كتاب النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم	مچائی تو اس حادثہ میں اہل طائف کیلیے
لاهل الطائف لما نهب جيش	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب
قتادة البلاد۔	گم ہوگیا۔

نیز تمیم بن حمد ابن ثقفی کا یہ بیان نقل کیا ہے:

فقد الكتاب فی جملة ما	دیگر چیزوں کے ساتھ یہ مکتوب بھی

[1] کتاب الخراج ص ۶۳ [2] فتوح البلدان ص ۸۳ و ۸۴

ما فقدناه، وهو كان عند	ضائع ہوگیا، میرے والد اپنے قبیلہ
أبی لكونه شيخ قبيلته[1]	ثقیف کے سردار تھے، یہ مکتوب ان ہی
	کے پاس تھا۔

تمیم داری کے نام تحریر: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمیم بن اوس داری اور ان کے بھائی نعیم بن اوس داری کو ملک شام میں جبری اور بیت عینون کی پیشگی جاگیر عطا فرمائی، اور ان کو اس کے بارے میں ایک تحریر دے دی جس کو انھوں نے محفوظ رکھا، جب عہد فاروقی میں ملک شام فتح ہوا تو تمیم داری وہ تحریر لے کر حضرت عمرؓ کے پاس آئے، آپ نے اس کی تصدیق کر کے وہ جاگیر دے دی۔

ابو عبید قاسم بن سلام کا بیان ہے:

فلما استخلف عمر الظهر	جب حضرت عمرؓ اپنے دور خلافت
علی الشام، جاء تميم الداری	میں ملک شام پر قابض ہوئے تو
بكتاب النبیؐ صلی اللہ علیہ	تمیم داری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
وسلم، فقال عمر انا شاهد	کی تحریر لے کر آئے، حضرت عمرؓ نے
ذلك، فاعطاها	اس کو دیکھ کر کہا کہ ہاں میں اس کا گواہ ہوں
اياه[2]	اور وہ جاگیر ان کو دے دی۔

خلیفہ ہشام بن عبد الملک اس علاقہ سے بہت احترام و احتیاط کے ساتھ گذرتا تھا، اور کہتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کردہ جاگیر سے گذرتے ہوئے ڈر رہا ہوں،

ابن درید نے کتاب الاشتقاق میں تمیم داری کی جاگیر اور مکتوب نبویؐ کا ذکر کیا ہے،

[1] العقد الثمین فی تاریخ البلد الامین ج ۷، ص ۴۶۔ [2] کتاب الاموال ص ۲۸۴۔

اور اس کے حاشیہ میں ابن شحنہ کے پوتے محمد بن عمر کا بیان درج ہے کہ ہمارے زمانہ میں تمیم داری کی اولاد میں یہ منشور نبویؐ موجود تھا، جس میں حبری اور بیت عینون کی جاگیر کا عطیہ درج ہے، اس کو مقامی لوگ "انطار" کہتے ہیں، کیونکہ اس کی ابتدا، ہذا ما اعطی محمد ابن عبد اللہ الخ سے ہے، یہ مکتوب ہرن کی کھال میں بخط کوفی حضرت علیؓ کے ہاتھ کا ہے، اس خاندان میں ایک عالم تقی الدین بہت صاحب علم و ادب اور بڑی سمجھ بوجھ کے تھے، سلطان مراد کے دور سلطنت میں ان کو سلطانی دربار میں باریابی ہوئی تو انھوں نے یہ مکتوب نبویؐ شاہی خزانہ کو ہدیہ کر دیا، اور اس کے بدلہ مصر میں عہدۂ قضا پایا، اسی دوران شیخ تقی الدین حلب سے گذرتے ہوئے میرے والد سے ملے تو انھوں نے کہا کہ تم نے بڑی غلطی کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب کو جہنم کے ایک ٹکڑے کے عوض فروخت کر دیا ہے، [1]

ایک جعلی تحریر یہودیوں کے بارے میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یادگار تحریروں کے سلسلہ میں یہ حکایت دلچسپ ہے کہ پانچویں صدی میں بغداد کے وزیر ابو القاسم بن مسلمہ کو ایک یہودی نے ایک قدیم تحریر دی، اور دعویٰ کیا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر ہے، جس میں اہل خیبر سے جزیہ ساقط کیا گیا ہے، وزیر موصوف نے یہ تحریر تحقیق کے لیے امام ابو بکر خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ کو دکھائی، انھوں نے بتایا کہ یہ تحریر سراسر جعلی اور جھوٹی ہے، اس میں معاویہ ابن ابو سفیان کی شہادت ہے جو غزوۂ خیبر کے بہت بعد فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئے تھے، اسی طرح اس میں سعد بن معاذؓ کی شہادت ہے، حالانکہ ان کی وفات اس سے پہلے غزوۂ خندق کے موقع پر ہوئی ہے۔[2]

وفود عرب کی تحریریں

سیر و مغازی کی ابتدائی تحریری ماخذوں میں عہد نبویؐ کی وہ تحریریں بھی

[1] کتاب الاشتقاق اور اس کا حاشیہ ص ۷۷، [2] المنتظم ج ۸ ص ۲۶۵۔

بڑی اہم اور مستند ہیں جو عرب کے مختلف قبائل اور دور دراز مقامات سے خدمت نبویؐ میں آنے والے وفود کے پاس محفوظ تھیں، اور جب اس فن کی تدوین کا دور آیا تو ان سے کام لیا گیا، ابن سعد نے ستر سے زائد وفود کا تذکرہ کیا ہے جو اپنے قبائل کے نمایندے اور ترجمان کی حیثیت سے خدمت نبویؐ میں حاضر ہوئے، ان کے ارکان کی تعداد بعض اوقات چار سو یا اس سے زائد ہوتی تھی، قبائل اپنے وفود کی روانگی کے لیے بڑا اہتمام کرتے تھے، اس کیلئے شیوخ و سردار، اعیان و اشراف، شعراء و خطباء اور باشعور افراد کا انتخاب ہوتا تھا، ان سب کے نام لکھے جاتے تھے اور ارکان وفد اپنے روایتی اور قبائلی لباس و ہیئت میں سج دھج کر مدینہ منورہ میں حاضر ہوتے تھے، یہاں ان کی حیثیت کے مطابق قیام و طعام کا انتظام کیا جاتا تھا، اور انکا احترام و اجلال کیاجاتا تھا اور وہ کچھ دنوں خدمت نبویؐ میں رہ کر قرآن اور ضروریات دین کی تعلیم حاصل کرتے تھے، واپسی پر عربی روایت کے مطابق ارکان وفد کو گراں قدر عطیات سے نوازا جاتا تھا اور بنیادی امور کے لیے تحریر دی جاتی تھی۔

واپسی کے بعد قبائل اپنے وفد کی پوری تفصیل لکھتے تھے، جس میں ارکان وفد کے نام اور خدمت نبویؐ میں حاضری وغیرہ کا تذکرہ ہوتا تھا، ایسی تحریری روداوں اور یادداشتوں کو یادگار کے طور پر محفوظ رکھا جاتا تھا، دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں،

وفد بنی سلامان کی تحریر

شوال ۱۰ھ میں قبیلہ بنی سلامان بن سعد کا ایک وفد سات افراد پر مشتمل خدمت نبویؐ میں حاضر ہوا، رملہ بنت حارث کے مکان میں اس کے قیام کا انتظام کیا گیا، ارکان وفد میں حبیب بن عمرو سلامانی بھی تھے، ان کی زبانی اس وفد کی پوری تفصیل تحریری شکل میں محفوظ تھی، محمد بن یحییٰ بن سہل بن ابو حثمہ کا بیان ہے،

وجدت فی کتب ابی ان حبیب　　میں نے اپنے والد کی کتابوں میں یہ لکھا ہوا

بن عمرو السلامانی کان	پایا ہے کہ حبیب بن عمرو سلامانی بیان کرتے
یحدث قال : قدمنا وفد	تھے کہ ہم وفد سلامان رسول اللہ صلی اللہ علیہ
سلامان علی رسول اللہ صلی	وسلم کے پاس گئے، ہم سات نفر تھے، ہم نے
اللہ علیہ وسلم ونحن سبعة،	دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے
فصادفنا رسول اللہ صلی اللہ	نکل کر ایک جنازہ کے لیے جا رہے ہیں،
علیہ وسلم خارجًا من المسجد	جس میں آپ کو بلایا گیا تھا، ہم نے کہا السلام
الی جنازة دعی الیہا، فقلنا	علیک یا رسول اللہ! آپ نے سلام کا
السلام علیک یا رسول اللہ! فقال،	جواب دے کر دریافت فرمایا کہ تم لوگ
وعلیکم، من انتم؟ قلنا نحن من	کون ہو؟ ہم نے بتایا کہ ہم لوگ قبیلہ سلامان
سلامان قدمنا لنبایعک علی	سے ہیں، آپ کے پاس آئے ہیں تاکہ
الاسلام ونحن علی مَن ورائنا	آپ سے اسلام پر بیعت کریں، ہم اپنے
من قومنا، فالتفت الی ثوبان	قبیلہ کی طرف سے ذمہ دار بن کر آئے ہیں،
غلامہ، فقال : انزل ھولاء	یہ سن کر آپ نے اپنے غلام ثوبان سے
الوفد حیث ینزل الوفد	فرمایا کہ جہاں وفود اترتے ہیں وہیں اس
فلما صلی الظھر جلس بین	وفد کو اتارو، اور جب آپ ظہر کی نماز پڑھ کے
المنبر وبیتہ فتقدمنا الیہ	منبر اور اپنے مکان کے درمیان بیٹھے
فسألناہ عن امر الصلاة، و	تو ہم نے آگے بڑھ کر آپ سے نماز،
شرائع الاسلام وعن الرقی و	اور اسلامی احکام اور منتر کے بارے میں
اسلمنا، واعطی کل رجل منا	سوالات کیے، اور اسلام قبول کر لیا،

خمس اواق، ورجعنا	آپ نے ہم میں سے ہر شخص کو پانچ پانچ
الی بلادنا، وذلک فی	اوقیہ سونا عطا فرمایا، اور ہم اپنے وطن
شوال سنة عشر[1]	واپس ہو گئے، یہ واقعہ شوال ۱۰ھ
...	کا ہے۔

وفد بنی عذرہ کی تحریر — صفر ۹ھ میں قبیلۂ عذرہ کا ایک وفد جو بارہ [۱۲] افراد پر مشتمل تھا، خدمت نبوی میں آیا، جس کی تفصیل قبیلہ عذرہ کے یہاں کتابی شکل میں موجود تھی، ابو عمرو بن حریث عذری نے اپنے قبیلہ میں یہ کتاب دیکھی تھی، ان کے والد نے اس کو محفوظ رکھا تھا، ان کا بیان ہے:

وجدت فی کتاب آبائی،	میں نے خاندانی کتاب میں دیکھا ہے
قالوا : قدم علی رسول اللہ صلی	کہ ارکان وفد نے بیان کیا ہے کہ
اللہ علیہ وسلم فی صفر سنة	صفر ۹ھ میں بارہ [۱۲] افراد پر مشتمل
تسع وفدنا اثنا عشر رجلا،	ہمارا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
فیھم حمزة بن النعمان	کے پاس گیا، ان میں حمزہ بن نعمان
العذری وسلیم وسعد ابنا	عذری اور سلیم بن مالک اور سعد بن
مالک ومالک بن ابی رباح	مالک اور مالک بن ابو رباح
فنزلوا دار رملة بنت	بھی تھے، یہ لوگ رملہ بنت حارث
الحارث النجاریة، ثم	نجاریہ کے مکان میں اترے، اور
جاءوا الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس

[1] طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۳۳۲ و ۳۳۳ و اصابہ ج ۱ ص ۳۲۲۔

فسلموا السلام اهل الجاهلية وقالوا: نحن اخوة قصى لامه، ونحن الذين ازاحوا خزاعة وبني بكر عن مكة، ولنا قرابات وارحام فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم مرحبًا بكم و اهلاً، ما اعرفني بكم، ما منعكم من تحية الاسلام، قالوا قدمنا مرتادين لقومنا وسألوا النبي صلى الله عليه وسلم عن اشياء من امر دينهم فاجابهم فيها واسلموا واقاموا اياما ثم انصرفوا الى اهليهم فامر لهم بجوائز كما كان يجيز الوفد وكسا احدهم بُردًا[1]

آکر جاہلیت کے طریقہ پر سلام کیا، اور کہا کہ ہم لوگ قصی کے اخیافی بھائی ہیں، ہم نے خزاعہ اور بنو بکر کو مکہ سے نکالا ہے، اور آپ سے ہماری قرابتیں اور خاندانی تعلقات ہیں، رسول اللہ ﷺ نے مرحبا کہہ کر ان کا استقبال کیا اور فرمایا کہ تم لوگوں نے بہت اچھے انداز میں اپنا تعارف کرایا ہے، تم لوگوں نے اسلام کا سلام کیوں نہیں کیا؟ ارکانِ وفد نے کہا کہ ہم اپنی قوم کے نمائندے بن کر آئے ہیں، اور پھر انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے دین کے بارے میں سوالات کیے اور آپ نے انکے جوابات دیئے، اسکے بعد وہ لوگ مسلمان ہوگئے اور چند دن قیام کرکے وطن واپس ہونے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے حسب عادت انکو عطیات سے نوازا، اور ان میں سے ایک شخص کو چادر عنایت فرمائی۔

وثائق نبویہ کا پورا ذخیرہ احادیث اور سیر و مغازی کی کتابوں میں محفوظ ہے، یہاں چند ایسے خطوط اور رسائل اور مکاتیب کا ذکر کیا گیا ہے جو بطور یادگار کئی صدیوں تک محفوظ رہے، تحقیق و تلاش کے بعد اس قسم کی عہد نبوی کی مزید یادگار تحریریں جمع کی جا سکتی ہیں۔

[1] طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۳۳۱ و ۳۳۲۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے بعض امتیازی کارنامے

از

ضیاء الدین اصلاحی

(۳)

حنفی مذہب کے دلائل کا ذکر

شیخ عبدالحقؒ مسلکاً حنفی تھے، انھوں نے کوشش کی ہے کہ اس شرح میں حنفی مذہب کو احادیث سے مدلل کرکے پیش کریں، مثلاً آپ نے فرمایا جس کو طلوعِ شمس سے پہلے صبح کی ایک رکعت مل گئی اس کو صبح کی نماز مل گئی اور جس کو عصر کی ایک رکعت غروب آفتاب سے پہلے مل گئی، اس کو عصر کی نماز مل گئی، اس کی شرح میں شیخ عبدالحقؒ لکھتے ہیں

"اکثر اہل علم کا قول یہی ہے کہ آفتاب کے طلوع و غروب کے وقت فجر و عصر کی نماز باطل نہیں ہوگی مگر امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب نے اس میں تفریق کی ہے، ان لوگوں کے خیال میں فجر کی نماز طلوع آفتاب کے وقت باطل ہو جائیگی البتہ عصر کی نماز غروب کے وقت باطل نہیں ہوگی، امام ابویوسفؒ سے ایک روایت عدم تفریق کی بھی کی گئی ہے کہ طلوع کے وقت فجر کی نماز باطل نہیں ہوگی، لیکن انتظار کرنا چاہئے تاکہ آفتاب اوپر آجائے اور بلند ہو جائے تب نماز ادا کی جائے"

جمہور کی دلیل یہی حدیث ہے جس کو اس بحث کی ابتدا میں نقل کیا گیا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث ان حدیثوں کے معارض ہے جن میں طلوع و غروب کے وقت نماز پڑھنا ممنوع قرار دیا گیا ہے خواہ فرض نماز ہو یا نفل ہو، اس بنا پر ہم نے قیاس پر عمل کیا کیونکہ تعارض کا یہ متعین و

ثابت اصول ہے کہ جب دو آیتوں میں تعارض ہو تو حدیث کی جانب رجوع کیا جائے گا اور اگر دو حدیثوں میں تعارض ہو تو قیاس کی جانب رجوع کرنا چاہیے، اس اصول و قاعدہ کے مطابق قیاس نے نماز عصر کے بارہ میں زیر بحث حدیث کو مرجح قرار دیا اور فجر کی نماز کے سلسلہ میں نہی کی حدیثوں کو راجح قرار دیا اس لئے کہ فجر کی نماز کا تمام وقت کامل اور نقص سے خالی ہے اس لئے کمال کی صفت سے اس کا متصف ہونا ضروری ہے، طلوع آفتاب سے اس میں نقص ہو جاتا ہے، ایسے وقت میں نماز کی ادائیگی اس طرح نہیں ہو سکتی جیسی ضروری اور مطلوب ہے، اس کے برعکس نماز عصر کا آخری وقت جب آفتاب زرد ہو جاتا ہے کامل کے بجائے ناقص ہے، ایسے وقت میں نماز عصر کا وجوب عدم کمال اور نقص کی حالت میں ہوا ہے اس لئے آفتاب کے غروب ہونے کی وجہ سے جو نقص طاری ہوگا اس میں نماز فاسد نہیں ہوگی بلکہ جس طور پر اور جس حالت میں واجب ہوئی تھی اسی طور پر اور اسی حالت میں ادا بھی ہوگی۔

شوافع کے نزدیک نہی کی احادیث صرف نفل نمازوں کے ساتھ مخصوص ہیں چنانچہ وہ تینوں اوقات منہی عنہا میں فرائض ادا کرنے کو جائز خیال کرتے ہیں حالانکہ احادیث کا ظاہر عموم کا متقاضی ہے۔[۱]

ایک اور مسئلہ لیجیے، رافع بن خدیج سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اسفروا بالفجر فانہ اعظم للاجر

فجر کی نماز میں اسفار کر دینی روشنی میں اسے ادا کرو کیونکہ اس میں اجر و ثواب زیادہ ہے

شیخ لکھتے ہیں:

[۱] اشعۃ اللمعات ج اول ص [illegible]

"حدیث کی عبارت سے یہ ظاہر متبادر ہوتا ہے کہ نماز اسفار کے وقت شروع کرنی چاہیے اور اسفار صبح سے تاریکی چھٹ جانا اور روشنی پھیل جانا مراد ہے، اس کے علاوہ جو کچھ کہا جاتا ہے وہ تاویل و تکلف سے خالی نہیں، ہمارے مذہب کے مشایخ سے اسفار کی تحدید اس طرح منقول ہے کہ چالیس سے ساٹھ یا اس سے بھی زیادہ سو آیتوں تک مسنون قرأت ترتیل کے ساتھ پڑھی جائے اور نماز سے فراغت کے بعد اتنا وقت رہے کہ اگر کسی سہو کی وجہ سے وضو اور نماز کو دہرانا پڑے تو طلوع آفتاب سے پہلے ایسا کیا جا سکے۔ ان لوگوں کا بیان ہے کہ حضرات شیخین (ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) ایسا ہی کرتے تھے۔ امام شافعی کا مذہب تغلیس ہے یعنی اول وقت میں جب کہ تاریکی ہو فجر کی نماز ادا کی جائے، وہ فرماتے ہیں کہ اسفار سے تاخیر مراد ہے تاکہ یقین ہو جائے کہ صبح طلوع ہو گئی ہے، پس ان کے نزدیک طلوع صبح کے خیال و گمان میں جلدی نہیں کرنا چاہیے بلاشبہ وقت کے دخول کا یقین ہو جانے پر نماز پڑھنا زیادہ اجر و ثواب کا باعث اور افضل ہے، لیکن یہ تاویل بعید ہے کیونکہ حدیث سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ اجر کی عظمت اس خصوصیت کے اعتبار سے ہے جو اسفار کے اندر ہے نہ کہ وقت کے تحقق کے اعتبار سے ہے جو تمام نمازوں کے اوقات کے لئے عام ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسفار کا حکم احتیاط کی وجہ سے صرف چاندنی راتوں کے لئے دیا گیا ہے کیونکہ ایسی راتوں میں چاندنی کا واضح اور نمایاں ہونا مشتبہ ہوتا ہے، امام طحاوی جو ہمارے مذہب کے ائمہ میں ہیں فرماتے ہیں کہ نماز کی ابتدا تغلیس (تاریکی) میں کرنی چاہیے اور ختم اسفار (روشنی) میں، یعنی اتنی طویل قرأت کرے کہ دونوں وقت جمع ہو جائیں بعض لوگوں نے اس تاویل کو اولیٰ و افضل قرار دیا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے دونوں طرح کی روایتوں پر عمل ہو جاتا ہے اور ان میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے لیکن واضح حنفی مذہب یہ ہے کہ آغاز و اختتام دونوں اسفار میں ہونا چاہیے

لیکن اتنی تاخیر نہیں کرنی چاہیے کہ آفتاب طلوع ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے

امام احمدؒ سے ایک روایت یہ ہے کہ تقدیم افضل ہے اور دوسری روایت کے مطابق اسفار بہتر ہے ان سے ایک اور روایت یہ کی گئی ہے کہ مقتدیوں کی حالت کا اعتبار کرنا چاہیئے کیونکہ جماعت کی فضیلت اعلیٰ و احسن ہے ان لوگوں کا استدلال حضرت معاذؓ کی یہ روایت بھی ہے کہ انہیں رسول اللہ صلعم نے یمن بھیجا اور فرمایا کہ جاڑے میں تغلیس کر دینی اندھیرے میں نماز پڑھو اور قرأت لمبی کرو مگر لوگوں کی قوت کا لحاظ بھی رکھو یعنی قرأت اتنی طویل نہ ہو کہ لوگ دل برداشتہ ہو جائیں، اور گرمی میں اسفار کرو کیونکہ اس موسم میں رات چھوٹی ہوتی ہے اور لوگوں کی نیند نہیں کھلتی اس لئے اس کا لحاظ کیا جائے تاکہ سب لوگ جماعت میں حاضر ہو سکیں۔

اس روایت سے استدلال کرنے والے کہتے ہیں کہ جب اس میں بعض لوگوں کی حاضری کا خیال اس قدر رکھا گیا ہے تو اگر سارے لوگ تاخیر کرتے ہوں تو بدرجۂ اولیٰ بلا اختلاف ان کا لحاظ کرنا اور نماز میں تاخیر کرنا چاہیے۔

امام شافعیؒ اور دوسرے ائمہ جو نماز میں تعجیل (عجلت) کو مستحب بتاتے ہیں یہ فرماتے ہیں کہ ادائے عبادت میں تقدیم مسارعت ہے اس لئے یہ افضل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ اسفار کی وجہ سے جماعت بڑی ہوتی ہے جو بلاشبہ افضل ہے اور حضرت صلعم کے نے اس چیز میں مسارعت ہونی چاہیئے جو خدا کے نزدیک اولیٰ و افضل ہے۔ اس بارے میں فقہ و قیاس کا اقتضا یہ ہے کہ آخر وقت تک فجر کو موخر کرنا باجماع بلا کراہت مباح ہے لیکن جماعت میں تعدادکی کمی ایک کروہ امر ہے جس کا باعث مسابقت ہے، حضرت معاذؓ کو آپ نے طویل قرأت سے اسی لئے منع کیا اور فرمایا کہ اس کی وجہ سے تم لوگوں کو فتنہ و آزمائش میں ڈال دو گے حالانکہ

نماز میں طویل قرأت سنت ہے جو اول وقت میں نماز ادا کرنے کے لئے تعجیل و مسابقت سے کہیں زیادہ عمدہ اور فائق ہے۔

یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ آفتاب نکلنے کے وقت تک نماز کی جگہ بیٹھے رہنا مستحب ہے جس کا اہتمام اسفار کرنے میں ممکن اور آسان ہے لیکن تغلیس کی وجہ سے یہ زیادہ آسان اور ممکن نہیں ہوگا۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ روایات میں آنحضرت صلعم کے فعل سے بھی اسفار کا ثبوت ہے اور تغلیس کی جو روایت بیان کی جاتی ہے وہ اگر ثابت ہے تو غالباً اسے آپ نے سفر میں عذر کی بنا پر کیا ہوگا جیسا کہ مزدلفہ میں آپؐ سے تغلیس کا ثبوت ملتا ہے ان لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ جن روایتوں میں تغلیس کا ذکر ہے ان میں اس کا بھی تذکرہ ہے کہ عورتیں چادر لپیٹے فجر کی نماز پڑھ کر اندھیرے میں واپس آتی تھیں، یہ حدیث زیر بحث حدیث کے معارض ہے جبکہ اس میں آپ کے قول کا ذکر ہے اور ہمارے نزدیک قول فعل کے مقابلے میں مرجح ہے علاوہ ازیں تغلیس غالباً اس زمانہ کی بات ہے جب عورتوں کو نماز پڑھنے کے لئے باہر آنے اور جماعت میں شریک ہونے کا حکم تھا لیکن بعد میں یہ منسوخ ہو گیا اور عورتوں کو گھروں میں نماز ادا کرنے کا حکم دیا گیا[1]

بے تعصبی ان مثالوں سے کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ وہ خواہ مخواہ کے لئے حنفی مذہب کی پچ کرتے تھے اور اسے ہر حال میں حدیث کے موافق ہی ثابت کرنے کا تہیہ کئے رہتے تھے، اوپر ہم آمین کی بحث میں ان کی تقریر کا ملخص پیش کر چکے ہیں اس میں انہوں نے بہت واشگاف لفظوں میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ آمین بالجہر کی روایات تعداد میں زیادہ بھی ہیں اور صحیح بھی ہیں۔ رفع یدین کی بحث میں اگرچہ وہ حنفی مذہب کو مرجح قرار دیتے ہیں مگر جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کا عدم تعصب و عدم تشدد ظاہر ہوتا ہے ملاحظہ ہو۔

---

[1] اشعۃ اللمعات جلد اول کتاب الصلوٰۃ باب تعجیل الصلوٰۃ ص۱۵۵ و ۱۵۶۔

"تکبیر تحریمہ کے علاوہ کسی اور موقع پر ہاتھوں کو اٹھانے میں ہمارے اور شوافع کے درمیان اختلاف ہے اور حدیثیں دونوں کے حق میں وارد ہیں، اس میں قدر متحقق یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یا تو دونوں ہی چیزیں (رفع وعدم رفع) درست ہیں کہ کبھی آپ نے یہ فرمایا اور کبھی وہ، اور جس صحابی نے آپ کو جو کرتے دیکھا اسے بیان کیا، یا یہ توجیہ کی جائے کہ ابتدا میں تو رفع یدین پر آپ کا عمل رہا ہو مگر آخر میں یہ منسوخ ہوگیا ہو، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ رفع یدین نہیں کرتے تھے اور یہ وہ بزرگ جو اسلام کے شرائع واحکام سے واقف تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کی تلاش ودریافت میں لگے رہتے تھے اور اکثر وبیشتر سفر وحضر میں ساتھ ساتھ ہوتے تھے، اسی دوسرے احتمال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت علیؓ سے روایت کی جاتی ہے کہ وہ رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ دونوں چیزیں ثابت ہیں تب بھی راجح مسلک عدم رفع ہوگا کیوں کہ یہ سکون واطمینان کی صورت ہے جو نماز کے حال ومقتضا خشوع وخضوع کے زیادہ مطابق اور مناسب ہے۔

یہ بحث لمبی ہے جس پر شرح سفر السعادۃ میں بھی ہم گفتگو کرچکے ہیں واللہ اعلم"[1]

شرح سفر السعادہ میں بھی اسی انداز سے بحث کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مسائل میں بھی جو دونوں فرقوں میں معرکۃ الآرا تھے وہ تشدد سے کام نہیں لیتے بلکہ جو کچھ لکھتے ہیں اس کو مدلل ومعقول انداز میں لکھتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ اس کے باوجود بھی چاہے کسی کو پورا اطمینان نہ ہو۔

اس کی مزید مثالیں بھی ہیں جو طوالت کی وجہ سے قلم انداز کی جاتی ہیں۔

ان کی بے تعصبی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ حنفی مذہب ہی کی طرح دوسرے فقہی مذاہب کو بھی بے کم وکاست نقل کرتے ہیں اور ان کے دلائل کو اس طرح بیان کرتے ہیں جس سے ان کی رواداری اور عدم تعصب کا پتہ چلتا ہے، اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں، ایک مثال سے ہمارا مدعا واضح ہوجائیگا۔

---

[1] اشعۃ اللمعات ج اول ص ۱۹۳

نماز جلد ادا کرنے کی فضیلت کے بیان میں لکھتے ہیں

"اس بارہ میں ائمہ کا مذہب مختلف ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک اول وقت میں نماز ادا کرنا بلا تفصیل افضل ہے اور گرمی کے زمانہ میں ظہر کی نماز میں ابراد کرنے کا جو حکم وارد ہے وہ ان کے نزدیک دراصل رخصت ہے اور وہ بھی ان لوگوں کے لیے جن کو جماعت میں آنے کے لیے دور تک کا راستہ طے کرنا پڑتا ہو، باقی جو لوگ تنہا نماز پڑھتے ہوں یا جن کے گھر مسجد کے قریب ہوں ان کے لیے رخصت نہیں ہے اور بعض شوافع ابراد کی تاویل زوال سے کرتے ہیں، امام مالک کا مسلک بھی اس سے قریب تر ہے مگر ان کے بعض اصحاب تنہا نماز ادا کرنے والے کے لیے شدید گرمی اور تپش میں تبرید کو افضل قرار دیتے ہیں، امام احمد کا مختار مسلک یہی ہے البتہ ان کے یہاں جماعت کے طالب کیلئے تبرید مستحب ہے، وہ عصر کی تقدیم کو افضل مانتے ہیں، مغرب میں تعجیل باتفاق مستحب ہے، امام احمد کے نزدیک عشا میں تاخیر مستحب ہے، ان کے نزدیک مبادرت افضل ہے اور لوگوں کے اجتماع کے خیال سے اگر تاخیر کریں تو حرج نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ظہر میں ابراد فجر میں اسفار اور عشا میں تاخیر مستحب ہے، ان کے نزدیک عصر میں اس حد تک تاخیر کی جاسکتی ہے کہ آفتاب میں کوئی تغیر نہ ہو، گویا اس باب میں ان کے یہاں تفصیل ہے" (اشعۃ اللمعات ج اول ص ۱۵۱)

مختار ومرجح قول کی تعیین

وہ مختلف اقوال ومذاہب ہی بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ مختلف اقوال میں جمع وتطبیق کی بحد امکان کوشش کرتے ہیں اور جب یہ صورت ممکن نہیں ہوتی تو مختلف اقوال میں ترجیح دے کر مختار قول کی تعیین کرتے ہیں، مثلاً حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ

نهى رسول الله صلعم عن الوصال في الصوم فقال له رجل انك

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم وصال سے منع کیا تو ایک شخص نے آپؐ سے کہا کہ آپ تو اے

تواصل یارسول اللہ قال	اللہ کے رسول اس طرح کا روزہ رکھتے ہیں،
وایکم مثلی انی ابیت یطعمنی	فرمایا کہ تم میں سے کون آدمی میری طرح ہے
ربی و یسقینی	میں تو رات بسر کرتا ہوں اس حال میں کہ
	میرا رب مجھ کو کھلاتا پلاتا ہے

حدیث کے آخری فقرہ کی شرح میں شیخ عبدالحقؒ لکھتے ہیں

"اس طعام و شراب کے بارے میں علماء کے چند اقوال ہیں، پہلا قول یہ ہے کہ یہ طعام و شراب (کھانا پینا) محسوس صورت میں تھا جو ہر رات میں آپؐ کے لئے پروردگار عالم کے یہاں سے آتا تھا اور آپؐ اسے تناول فرماتے تھے، یہ ایک کرامت تھی جو اللہ کی جانب سے آپؐ کے لئے مخصوص تھی اور یہ وصال کے منافی اور روزہ کے باطل ہونے کا باعث نہیں تھی، چنانچہ دوسری روایت میں اظل عند ربی یطعمنی و یسقینی آیا ہے کہ میں روزہ سے ہوتا ہوں، میرا خدا اپنے یہاں سے مجھے طعام و شراب دیتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ خدا کے یہاں کا یہ کھانا پینا موجب افطار نہیں ہوتا تھا جس طرح کہ معتاد کھانا پینا شرعی افطار کا موجب ہوتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ طعام و شراب سے یہاں وہ طاقت و قوت مراد ہے جو کھانے پینے کی وجہ سے لازماً حاصل ہوتی ہے، اس طرح آپؐ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھے میرا پروردگار کھانے پینے والے کی ایسی قوت بخشتا ہے جو میرے لئے طعام و شراب کا بدل ہوتی ہے اور بھوکے پیاسے ہونے کے باوجود اس کی وجہ سے اطاعت و عبادت کی میری قوت قائم و باقی رہتی ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ طعام و شراب سے کھانے پینے کی سیری و سیرابی مراد ہے۔

لوگوں کا خیال ہے کہ پہلا مفہوم مرجوح ہے کیونکہ سیری و سیرابی روزہ دار کے حال کے منافی ہے اور اس سے صوم وصال کا مقصد فوت ہو جاتا ہے جب کہ اس عمل کی روح ہی تشنگی اور بھوک ہے، خود رسول اللہؐ اکثر

بھوک کی اتنی شدت محسوس کرتے تھے کہ شکم مبارک پر پتھر باندھ لیا کرتے تھے، فتح الباری میں بھی لکھا ہے مگر مختار قول یہ ہے کہ نہ اس سے محسوس کھانا پینا مراد ہے اور نہ قوت و آسودگی اس کا مقصد ہے بلکہ اس سے وہ غذائے روحانی مراد ہے جو معارف و مناجات کی لذتوں اور لطائف الٰہی کے فیضان کے نتیجہ میں آپ کے مبارک دل کو حاصل ہوتی تھی اور جس کی وجہ سے آپ جسمانی غذا اور اس کے لوازم سے مستغنی ہو جاتے تھے اور یہ تو مجازی محبت اور جسمانی مسرت کے سلسلہ میں بھی ایک آزمائی ہوئی بات ہے اور جب معاملہ حقیقی محبت اور معنوی مسرت کا ہو تو اس میں کہنا ہی کیا اور یہی حقیقی محبت اور معنوی مسرت آپ پر طاری تھی۔

صوم وصال کے بارہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے اشخاص کے لیے جائز ہے یا حرام ہے یا مکروہ ہے، ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ جو شخص اس پر قادر ہو اس کے لئے جائز ہے اور اس کی ممانعت رحمت، شفقت اور سہولت کے خیال سے آئی ہے، جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی روایت میں اس کی تصریح بھی آئی ہے اور بعض صحابہ مثلاً عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ اور تابعین مثلاً عبداللہ بن ابی معمر و عامر بن عبداللہ بن زبیر وغیرہ سے یہی منقول ہے۔

اکثر لوگوں کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے، امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ نے اس کی کراہت کی تصریح کی ہے، البتہ ان لوگوں کا اختلاف اس میں ہے کہ یہ مکروہ تحریمی ہے یا تنزیہی، پہلا قول صحیح تر ہے۔

امام احمد فرماتے ہیں کہ صوم وصال سحر تک کے لیے جائز ہے لیکن درحقیقت اسے صوم وصال نہیں کہا جائے گا بلکہ یہ تو افطار میں تاخیر ہوئی، جمہور کا مسلک یہ ہے کہ وصال نبوت کے خصائص میں سے ہے اور حدیث کے ظاہر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے"۔

اجمال و ابہام کی تفصیل و توضیح بعض حدیثوں میں کسی امر کا مجمل و مبہم انداز میں ذکر ہوتا ہے، ایسے موقع پر وہ تفصیل و توضیح

کر کے اجمال و ابہام کو رفع کر دیتے ہیں اور اس کی وجہ سے حدیث کے مفہوم میں جو خفا و اشتباہ پیدا ہوتا ہے اسے بھی حل کر دیتے ہیں مثلاً ایک مشہور حدیث ہے کہ

(لا تشد الرحال الا الی ثلثة مساجد المسجد الحرام والمسجد الاقصیٰ ومسجدی هذا)

تین مسجدوں کے سوا (اور کہیں کا) سفر نہ کیا جائے مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور میری اس مسجد (مسجد نبوی)

شیخ اس کا مطلب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"بظاہر اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے ان تین جگہوں کے جن کو اللہ تعالیٰ نے فضیلت، عظمت اور کرامت سے بہت زیادہ مخصوص و ممتاز بنایا ہے کسی اور جگہ کے لئے سفر کرنا ممنوع ہے گو دوسرے مقامات فضیلت، برکت اور قربت کا باعث ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ شارعؑ کی زبان پر ان میں سے کسی جگہ کا نام بھی نہیں آیا لیکن اس حدیث کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ان جگہوں کے علاوہ کسی اور جگہ کا سفر عبادت اور تقرب الٰہی کے خیال سے اور نماز پڑھنے کے لئے نہ کیا جائے لیکن اگر کوئی ضرورت درپیش ہو جیسے علم کی تحصیل، تجارت یا کوئی اور ضروری حق ادا کرنا تو سفر کرنا جائز ہوگا۔

صلحا کی قبروں کی زیارت اور متبرک جگہوں کو جانے کا معاملہ تو اس میں اختلاف ہے، بعض لوگ اسے مباح اور بعض حرام بتاتے ہیں۔ جیسا کہ مجمع البحار میں ہے۔ واللہ اعلم

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نذر و نیاز کے ارادہ سے ان تین جگہوں کے علاوہ اور کہیں جانا درست نہیں ہے اور اگر کوئی ان تین جگہوں کے علاوہ کہیں اور کی نذر مانے تو یہ نذر واجب نہ ہوگی اور نہ اس کو پورا کرنا لازمی ہوگا۔ بعض علما فرماتے ہیں کہ یہاں گفتگو صرف مساجد کی چل رہی ہے

اس لئے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان تین مسجدوں کے سوا کسی اور مسجد کے لئے سفر کرنا جائز نہیں ہے، باقی مسجد کے علاوہ عام جگہوں اور مقامات کا اس میں سرے سے کوئی ذکر نہیں ہے مجھ بندہ ناچیز کا خیال یہ ہے کہ اس میں ان تین جگہوں کی اہمیت اور عظمت شان بیان کرنا مقصود ہے اور ان کے سفر کرنے کا بھی ذکر اسی لئے کیا کہ یہ دنیا کے متبرک ترین مقامات ہیں یعنی بس اگر کوئی سفر کرے تو انہی جگہوں کے لئے کرے، یہ مطلب نہیں ہے کہ کہیں اور کا سفر ہی نہ کرے۔" (اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۱۶۹)

احادیث کی تشریح قرآنی آیات سے

شیخ عبدالحقؒ کی شرح کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ وہ احادیث کا مفہوم واضح کرنے کے لئے جابجا قرآنی آیتیں بھی پیش کرتے ہیں، ذیل میں اس کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں

کتاب الایمان کی ایک مشہور حدیث کی جو حدیث جبریل کہلاتی ہے شرح میں لکھتے ہیں

"دین، اسلام، ایمان اور احسان کے مجموعہ سے عبارت ہے اور شریعت اسی مجموعہ کا نام ہے لیکن کبھی دین کا اطلاق خاص طور سے اسلام پر ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ — بلاشبہ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہی ہے۔ (آل عمران: ۱۹)

اور شریعت فروعی فقہی احکام کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے، اسی لئے شریعت طریقت اور حقیقت کہا جاتا ہے، یہ تینوں اور دوسرے تمام اجزاء و شعب دین ہیں" (اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۲۶)

ایک اور مشہور حدیث ہے کہ "ایمان کے ستر سے زائد شعبے اور اجزا ہیں" شیخ نے اس کا ترجمہ اور تشریح کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

"ایمان کے شعبے چاہے جس قدر بھی ہوں مگر اصلاً ان سب کا مرجع ایک ہی ہے اور وہ تکمیل نفس اور تحصیل سعادت ہے یعنی عقیدہ کی صحت اور عمل کی استقامت کے ساتھ علمی و عملی کمال کی تحصیل جیسا

قرآن مجید میں ارشاد ہے

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا (احقاف ۱۳)

بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا خداوند اللہ ہے پھر اسی پر جم گئے۔

ایک اور حدیث میں بھی یہی بات کہی گئی ہے کہ (قُلْ آمَنْتُ بِاللَّهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ)

یعنی کہو کہ میں اللہ پر ایمان لایا پھر اس پر استقامت اختیار کرو! (اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۱۲۷)

باب قتل اہل الردۃ والسعاۃ بالفساد میں ارتداد کے لغوی و اصطلاحی معنی بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں

مسلمان اگر اسلام سے برگشتہ اور بیزار ہو جائے تو اس پر اسلام پیش کرنا چاہیے، اگر اسے شکوک و شبہات پیدا ہو گئے ہوں تو انہیں دور کرنا چاہیے، لیکن یہ دونوں باتیں ضروری نہیں ہیں کیونکہ اسے اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہے اس لئے تجدید دعوت ضروری نہیں ہے، مستحب طریقہ یہ ہے کہ تین روز تک مرتد کو قید رکھا جائے، اگر مسلمان ہو جائے تو فبہا ورنہ اسے قتل کر دیا جائے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر وہ مہلت طلب کرے تو دے دینا چاہئے ورنہ اس کی بھی ضرورت نہیں ہے، مگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تین روز تک مہلت دینا واجب و لازم ہے لیکن نصوص سے ان کی تائید نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ من بدل دینہ فاقتلوہ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مہلت دینا واجب نہیں ہے۔

آگے لفظ "سعاۃ" افساد کے لئے سعی کرنے والے اور فتنہ انگیزی کرنے والے کی لغوی تحقیق کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں؛

"یہاں اس سے قطاع طریق (رہزن) مراد ہیں جیسا کہ فرمایا

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا (مائدہ: ۳۳)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے اور ملک میں فساد پھیلاتے پھرتے ہیں ان کی یہی سزا ہے کہ قتل کر دیے جائیں یا سولی دے دیے جائیں!

یا انہی کی طرح کے دوسرے لوگ مراد ہیں" (اشعۃ اللمعات جلد سوم صفحہ ۱۳۴)

اسی باب کی تیسری فصل میں یہ مشہور حدیث نقل کی گئی ہے کہ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی شہادت دینے والے کسی مسلمان کا خون حلال نہیں سوائے تین صورتوں کے، حدیث میں جو تین صورتیں بیان ہوئی ہیں ان میں سے ایک صورت یہ ہے "و رجل خرج محاربا باللہ و رسولہ" اس کی شرح میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی قطراز ہیں

"اس سے قاطع طریق مراد ہے جو رہزنی کرتا اور فساد برپا کرتا ہے جیسا کہ آیت کریمہ (الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا) میں گزرا تو ایسے شخص کو قتل کیا جائے گا یا پھانسی دی جائے گی یا جلا وطن کیا جائے گا" (ایضاً ۱۳۴)

صلح حدیبیہ کے بیان میں اس معاہدہ کے سلسلہ میں جو آپ کے اور مشرکین کے درمیان ہوا تھا اس کا ذکر آیا ہے کہ رسول اللہؐ کے لفظ پر جب مشرکین کو اعتراض ہوا تو آپ نے حضرت علیؓ کو اسے مٹانے کا حکم دیا مگر انہیں اس میں تکلف ہوا تو آپ نے ان سے عہدنامہ لے کر اسے مٹایا اور اس کی جگہ خود محمد بن عبداللہ تحریر فرما دیا، اس موقع پر حدیث میں و لیس یحسن یکتب اور فکتب ہذا ما قاضی علیہ محمد بن عبداللہ کے الفاظ وارد ہیں، اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان الفاظ کو آپ نے خود نہیں تحریر فرمایا تھا کیونکہ آپ لکھنا نہیں جانتے تھے، ان کے اس خیال کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو امی کہا ہے اور امی اس کو کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو، مگر بعض حضرات کہتے ہیں کہ امی ہونے کے باوجود آپ نے یہ تحریر فرما دیا تھا جو آپ کی نبوت کا ثبوت ہے بظاہر یہ حدیث ان لوگوں کی حجت اور دلیل ہے لیکن اس کو نہ ماننے والے یہ تاویل کرتے ہیں کہ یہاں کتابت سے کتابت کا حکم دینا مراد ہے، مجاز کا اس طور پر استعمال اہل زبان کے یہاں معروف ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ امیر نے شہر کی تعمیر کی حالانکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ امیر نے تعمیر و بنا کا حکم دیا جس کے نتیجہ میں وہ تعمیر ہوا کیونکہ کوئی امیر خود اپنے ہاتھ سے تعمیر نہیں کرتا۔

"اس بارہ میں اختلاف کا یہ خلاصہ ہے، اس کی تفصیل فتح الباری میں ہے شیخ ابن حجر کا دارومدار بخاری شریف کی اس روایت پر ہے جو مغازی میں ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے نوشتہ کو لیا درآنحالیکہ آپ اچھی طرح لکھنا نہیں جانتے تھے مگر آپ نے یہ تحریر فرما دیا کہ هذا ما قاضی به محمد بن عبد الله اس کے قائل ابوالولید باجی تھے جو مغرب کے کبار علماء میں تھے، ان کا دعویٰ ہے کہ باوجودیکہ آپ لکھنا نہیں جانتے تھے مگر پھر بھی آپ نے لکھا، اس دعوی کی وجہ سے علمائے اندلس نے ان پر طعن و تشنیع کی اور کفر و زندقہ کا الزام لگایا کیونکہ یہ دعوی قرآن مجید کے اس فرمان کے خلاف ہے

وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ (عنکبوت: ۴۸)

اور تم اس کتاب سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھے ہوئے تھے اور نہ کوئی کتاب اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے کہ ایسی حالت میں یہ ناحق شناس لوگ کچھ شبہ نکالتے۔

چنانچہ اس زمانہ کے بادشاہ نے علماء کو جمع کیا، جن کے سامنے ابوالولید باجی نے اپنے خیالات پیش کئے اور بتایا کہ میرا دعویٰ قرآن کے خلاف نہیں بلکہ اس کے مفہوم سے ماخوذ ہے کیونکہ یہاں خط و کتابت کی نفی کا ذکر نزول قرآن سے پیشتر کے ساتھ مشروط و مقید ہو کر آیا ہے، اس طرح سے تو آپ کی امیت بھی متحقق ہو جاتی ہے اور آپ کا یہ معجزہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ تعلیم کے بغیر آپ نے لکھ لیا، باجی کی یہ تقریر سن کر علماء کی ایک جماعت ان کی ہمنوا ہو گئی، ان میں سے بعض لوگوں نے ابن ابی شیبہ کی ایک حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جو مجالد کے واسطہ سے حضرت عون بن عبد اللہ سے مروی ہے کہ آنحضرت اس دنیا سے نہیں رخصت ہوئے مگر اس حال میں کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، مجالد کا بیان ہے کہ میں نے اس کا امام شعبی سے ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے بھی اسے کسی سے سنا ہے، قاضی عیاض مالکی فرماتے ہیں کہ اس بارے میں جو آثار و اخبار مروی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت حروف و خط شناس تھے اور اچھے خراب خط سے بھی واقف تھے مگر یہ بات اس کی دلیل نہیں ہے کہ آپ کتابت بھی کر لیتے تھے بلکہ یہ اس فن کے بارہ میں علم و واقفیت کا ثبوت ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر چیز کا علم عطا کیا گیا تھا۔

شیخ ابن حجر نے گو اس پر طویل بحث کی ہے مگر آخر میں یہی لکھا ہے کہ اس معاملہ میں درست بات یہ ہے کہ یہاں کتابت سے اس کا حکم دینا مراد ہے" (اشعۃ اللمعات جلد سوم ص ۲۳۹ و ۲۴۰)

باب الشفقۃ والرحمۃ میں لکھتے ہیں:۔

"رحمٰن و رحیم اللہ کے ناموں میں سے ہیں جو رحمت میں مبالغہ و تکرار یا صرف مبالغہ کے لئے لائے جاتے ہیں جیسے جاد مجد کہتے ہیں رحمٰن میں زیادہ مبالغہ ہے اور اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ خدا جس رحمت سے متصف ہے اس سے سوا کا تصور بھی

نہیں کیا جا سکتا اس لئے یہ باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کا اطلاق اس کے علاوہ کسی اور کے لئے نہیں ہو سکتا، لیکن رحیم کا اطلاق اللہ کے علاوہ دوسروں پر بھی ہو سکتا ہے اس تخصیص کی دلیل یہ آیت ہے قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ (ج ۴ ص ۶۲)

لفظوں کی تحقیق و وضاحت کے ضمن میں بھی وہ قرآنی آیتوں سے استدلال کرتے ہیں، مثلاً ایمان بالقدر کے باب میں قدر کے لغوی معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"قضا و قدر کے الفاظ ایک معنی میں بھی آتے ہیں اور کبھی لوگ اس میں فرق بھی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قضا حکم ازلی ہے اور قدر اس کے ہمیشہ واقع ہونے کا نام ہے، اس مفہوم کے اعتبار سے قضا قدر پر سابق و متقدم ہے جیسا کہ فرمایا

يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ	مٹا ڈالتا ہے اللہ جو چاہتا ہے اور ثابت
وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْكِتٰبِ (الرعد: ۳۹)	کرتا ہے اور نزدیک اس کے ہے اصل کتاب

محو و اثبات قدر سے عبارت ہے اور عندہ ام الکتاب سے قضا کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے برعکس بھی ہوتا ہے قدر تقدیر ازل کے معنی میں اور قضا پیدا کرنے کے مفہوم میں آتا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے

فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ (حم السجدۃ: ۱۲)	پس بنایا ان کو سات آسمان

یہاں قَضٰهُنَّ خَلَقَهُنَّ کے معنی میں ہے، اس مفہوم کے لحاظ سے جف القلم بما هو کائن کو تقدیر پر اور كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ کو قضا پر محمول کیا جائے گا"

اس پر مزید بحث کر کے جبر و قدر کا مفہوم واضح کیا ہے اور آخر میں یہ آیت بھی پیش کی ہے

وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ وَلَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ (ج ۱ ص ۴۹)

احادیث کی تشریح احادیث سے

احادیث کی تشریح میں احادیث سے مراجعت کرنے کی اوپر متعدد مثالیں گذری ہیں یہاں کچھ مزید مستقل مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ زکوٰۃ کے بیان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت کا ذکر ملتا ہے جو آپ نے محصلین کو دی تھی۔

فایاک وکرائم اموالهم	زکوٰۃ دینے والے کے اچھے اور عمدہ قسم کے
واتق دعوة المظلوم فانه	مال لینے سے اپنے کو دور رکھو اور مظلوم کی
ليس بينها وبين الله حجاب	فریاد سے بچو کیونکہ اس کے اور خدا کے
	درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا۔

شیخ عبدالحق محدثؒ اس کا مطلب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"زکوٰۃ وصول کرنے والے کو چیدہ قسم کا مال نہیں لینا چاہئے بلکہ جو کچھ مالک دیدے اسے لے بشرطیکہ مال صحیح سلامت اور عیب و نقص سے محفوظ ہو کیونکہ عیب دار اور ناقص مال شریعت میں روا نہیں، لیکن اگر زکوٰۃ دینے والے کا دل دکھا کر اور اس پر ظلم و ستم ڈھا کر اچھا مال وصول کرے گا تو اس کی آہ و فریاد خدا کی جناب میں پہنچ جاتی ہے اور وہ اسے سن لیتا ہے اور قبول کر لیتا ہے خواہ یہ مظلوم شخص کافر ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ بعض احادیث میں یہ بات بیان ہوئی ہے" (اشعۃ اللمعات ج ۲ ص ۱۰)

ایک مشہور حدیث ہے کہ عالم کو عابد پر اسی طرح کی فضیلت حاصل ہے جیسی چودھویں کے چاند کو فضیلت عام ستاروں پر ہے، اس کی شرح میں عالم و عابد کا فرق بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"عالم سے وہ شخص مراد ہے جو علم کی تحصیل کے بعد ضروری عبادت پر اکتفا کرتا ہے یعنی فرائض اور مؤکدہ سنتیں ادا کرتا ہے باقی اوقات تعلم و تعلیم اور تصنیف و تالیف کے لئے وقف رکھتا ہے، گویا اس کا کام علم کی نشر و اشاعت اور دین کی تبلیغ و ترویج ہوتا ہے اور عابد سے وہ مراد ہے جو تحصیل علم کے بعد عبادت میں مشغول رہتا ہے اور اس کے اوقات اسی میں صرف ہوتے ہیں چونکہ علم میں انہماک و اشتغال اور اس کی نشر و اشاعت سے لوگوں کو زیادہ فیض پہنچتا ہے

اس لئے بلاشبہ عالم کو عابد پر فضیلت حاصل ہے جیسا کہ دوسری حدیث سے اس کا یہ مفہوم اور اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے،

ان العلماء ورثة الانبیاء	بلاشبہ علما انبیا کے وارث ہیں اور انبیا
وان الانبیاء لم یورثوا	دینار و درہم کی میراث نہیں چھوڑتے بلکہ
دینارا ولا درہما وانما	علم کا ترکہ عطا کرتے ہیں، پس جس نے
ورثوا العلم فمن اخذہ	علم حاصل کیا اس کو حظ وافر نصیب
اخذ بحظ وافر (ج ۱ ص ۵۰)	ہو گیا۔

زبان کے اسالیب | کہیں کہیں وہ زبان کے اسلوب پر بھی بحث و گفتگو کرتے ہیں، مثلاً ید اللہ علی الجماعۃ کے متعلق لکھتے ہیں:

"یہ حفظ و امان اور نصرت سے کنایہ ہے، اہل حق کی جماعت پر اللہ کا خاص احسان ہوتا ہے اور اس کی جانب سے ان کی حفاظت ہوتی ہے اور وہ مخلوق کی ایذا اور دین کے دشمنوں کے خوف سے محفوظ رہتے ہیں اور اللہ کی توفیق خاص بطور خاص اس وقت ان کے شامل حال ہوتی ہے جب وہ احکام و مسائل کا استنباط کرتے ہیں اور حق کی دریافت میں سرگرداں رہتے ہیں مگر جب اختلاف کرتے ہیں اور متفرق ہو جاتے ہیں تو حفاظت و عصمت زائل ہو جاتی ہے اور اللہ کی سکینہ سے محروم رہتے ہیں، ان کے احوال و معاملات درہم برہم ہو جاتے ہیں اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کے معالم و طریقہ کو چھوڑ دیتے ہیں۔" (جلد ۱ ص ۱۶۸)

رغم انفہ کو ذلت و خواری اور ناگواری کے ساتھ انقیاد سے کنایہ بتایا ہے رغام کے اصل معنی خاک بتاتے ہیں اس لئے رغم انفہ کے اصلی معنی ہوں گے کہ اس کی ناک خاک آلود ہو۔ (ج ۴ ص ۵۵)

اسی طرح فلیس للہ حاجۃ فی ان یدع طعامہ و شرابہ کو عدم قبولیت سے کنایہ بتایا ہے یعنی روزہ کی فرضیت کا مقصد بھوک اور پیاس نہیں ہے بلکہ نفسانیت اور شہوت کے جذبات کو ختم کرنا ہے۔ (ج ۲ ص ۲۷۴)

وہ الفاظ کی نحوی تحقیق، مقامات کے ناموں کی تشریح اور راویوں وغیرہ کے بارے میں بھی معلومات تحریر کرتے ہیں،

غالب کا اخلاقی نقطۂ نظر

ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب پٹنہ

غالب کی رندی و سرمستی کا اتنا چرچا ہوا ہے کہ ان کی وسیع المشربی کا مفہوم بھی غلط ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں غالب کے اشعار کے ساتھ ساتھ ان کے خطوط کو بھی بہت استعمال کیا گیا ہے حالانکہ دونوں قسموں کے ادبی اظہار کے اشارات اتنے لطیف ہیں کہ ان کا کچھ بہتر مطلب بھی نکالا جا سکتا ہے۔ غالب کی سب سے مستند سوانح عمری حالی کی "یادگار غالب" ہی ہے اور اس کے مقابلے میں ان داستانوں کو کوئی علمی اہمیت نہیں دی جا سکتی جو کچھ لوگوں نے اپنے ذوق کے مطابق غالب سے منسوب کر رکھی ہیں۔ جس دور میں غالب نے زندگی گزاری وہ کوئی ماقبل تاریخ کا زمانہ نہیں ہے کہ اس کی ایک اہم ترین شخصیت کے متعلق افسانے تصنیف کئے جائیں۔ انیسویں صدی کے ہندوستان کے احوال کی تحقیق بہت مشکل نہیں۔ دلی میں اصحاب کمال کا مجمع تھا۔ خود غالب کے حلقۂ احباب میں علماء و فضلاء بھی تھے۔ سب سے بڑھ کر سیاسی اضمحلال کے باوجود تہذیبی انتشار اس حد تک نہیں پہنچا تھا کہ مشاہیر کی سیرت کی نمایاں خامیوں کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے اور ان کے ایسے افعال کا بھی محاسبہ نہیں کیا جائے جن کا ضرر خود سے بڑھ کر معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہو۔ اس عمرانی حقیقت کو مد نظر رکھ کر غالب کی شخصیت کا مطالعہ مستند معاصرین کی واضح شہادتوں کی روشنی میں کیا جائے تو شاعر کی ذاتی بے راہ روی کے متعلق قایم کئے ہوئے متعدد مفروضے غلط ثابت ہوں گے، جب کہ غیر ثقہ روایتوں اور افواہوں کی بنیاد پر ایک مرد معقول کو رند لاابالی تصور کرنا ایک نامعقول بات ہو گی۔

جہاں تک کسی ادیب یا شاعر کے اخلاقی نقطۂ نظر کا تعلق ہے، وہ اس کے شخصی اخلاق سے مختلف بھی ہو سکتا ہے۔ دانش وروں کے ذہن اور کردار کی جہتیں بعض اوقات ایک دوسری سے جدا ہوتی ہیں، ایک شخص کا ذہنی رویہ اس کے کردار کے انداز سے علاحدہ نظر آتا ہے۔ قول و فعل یا فکر و عمل کے اس تضاد کی نفسیاتی توجیہ جو بھی کی جائے اور اس پر اخلاقی تنبیہ جتنی بھی کی جائے اس کی حقیقت اور واقعیت سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاق اور اخلاقیات میں فرق ہوتا ہے۔ اخلاقیات اصول تہذیب اور اقدار حیات کا دوسرا نام ہے جو ایک علمی اصطلاح بن گیا ہے۔ یہ زندگی کے بارے میں ایک انسان کا کلی اور عمومی نقطۂ نظر ہے اور اس کا رشتہ ان روایات کے ساتھ بھی استوار ہوتا ہے جن کے آغوش میں فرد کی پرورش ہوتی ہے، اس کے شعور کا سانچہ بنتا ہے اور واقعات پر اس کا طبعی ردعمل سامنے آتا ہے۔

لہذا غالب کا اخلاقی نقطۂ نظر سمجھنے کے لئے اول تو غالب کی دلی کے اقدار حیات اور اطوارِ معاشرت کا مطالعہ کرنا چاہئے، دوسرے اشعار و مکاتیب میں غالب کے ان بیانات پر غور کرنا چاہئے جو انھوں نے اہم تہذیبی امور کے متعلق جاری کئے ہیں۔ شاعر کے بعینہ عقائد اور اس کی معروف سرگرمیوں پر بھی نظر ڈالنی چاہئے۔ انیسویں صدی میں دلی کا معاشرہ زوال آمادہ ضرور تھا مگر فنا نہیں ہوا تھا، ۱۸۵۷ء کے سیاسی انقلاب نے جہاں اہل ہند کی فوجی، صنعتی اور انتظامی کمزوریوں کا پول کھول دیا تھا، وہاں ان کے ذہنی احتجاج، اخلاقی مزاحمت اور علمی مقاومت کے بھی کچھ ثبوت پیش کئے تھے، پھر بھی وہ دور تھا جس میں تحریک مجاہدین کے آثار و اثرات بھی نمایاں تھے۔

اگر ان سب مظاہر کو ایک عظیم الشان تہذیب کا دم واپسیں بھی فرض کر لیا جائے، تو غالب کی شاعری کو کم از کم اس دم واپسیں کا اظہار تسلیم کرنا پڑے گا

اس معاملے میں غالب کی شاعرانہ وصیت کی اس پُر اثر، عبرت خیز اور فکر انگیز دستاویز کا تجزیہ

بہت مفید ہوگا:

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل ‏ ‏ زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ‏ ‏ میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی ‏ ‏ مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط ‏ ‏ دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ ‏ ‏ یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں ‏ ‏ نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی ‏ ‏ اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

پورے قطعے کا خلاصہ یہ مشہور فارسی نصیحت ہے "من نکردم، شما حذر بکنید" (میں جن برائیوں سے بچ نہیں سکا، تم ان سے بچو)۔ ان برائیوں میں سرِ فہرست "ہوسِ نائے و نوش" ہے، پھر نغمہ و طرب ہے چنانچہ ساقی کے جلوے کو "دشمن ایمان و آگہی" اور مطرب کے نغمہ کو "رہزن تمکین و ہوش" بتایا گیا ہے، اس لئے کہ لذت کام و دہن اور عشرت سامعہ و نظارہ کے یہ پُر لطف سامان عارضی و فانی ہیں، خرام ساقی ہو یا صدائے چنگ، صرف شب بھر کے لئے "جنت نگاہ" اور "فردوس گوش" ہیں، جب کہ صبح دم پوری بزم سرور و سوز اور جوش و خروش سے خالی ہو جاتی ہے، خواہ رات بھر بساط عیش کا ہر گوشہ "دامان باغبان و کف گل فروش" بنا رہا ہو۔ شاعر کو اقرار ہے کہ وہ عالم شباب میں فریب شب کھا چکا ہے، مگر صبح پیری میں اس کی آنکھیں کھل چکی ہیں اور وہ خود کو عبرت کا ایک مرقع تصور کرتے ہوئے لوگوں کو نصیحت کر رہا ہے۔ آخری شعر میں یہ سیاسی اشارہ بھی نظر آتا ہے کہ شب اقتدار ختم ہو چکی ہے اور اب اس کی آخری یادگار بھی گویا مٹ چکی ہے، خواہ یہ شمع خاموش بادشاہ دلی ہو یا قلعۂ شاہی اور مغلیہ دور میں بر دان

بڑھنے والی تہذیب کا ایک نمایندہ اور ترجمان، خود شاعر۔

غالب کا یہ پند نامہ دراصل ایک توبہ نامہ ہے۔ اس میں اعترافِ گناہ سے زیادہ اہم احساسِ گناہ ہے جس سے شاعر کا نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے اور واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص معاشرے کا باغی نہیں، اس کا وفادار تھا۔ اس لئے ارتکابِ گناہ پر اسے شرم آتی ہے، جو اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ معصیت پر عذر خواہی میں بھی تامل ہوتا ہے۔ شاعر اپنی بعض عادتوں سے یقیناً مجبور ہے، مگر اس کے عقیدے کی پختگی میں کوئی فرق نہیں آتا، بلکہ اپنے ایمان پر اسے ناز بھی ہے، اعتماد بھی:

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب شرم تم کو مگر نہیں آتی

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

حد چاہئے سزا میں عقوبت کے واسطے آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

یہی وجہ ہے کہ غمِ شراب کا مارا ہوا شاعر اپنے "غلامِ ساقیِ کوثر" ہونے پر فخر کرتا ہے۔ غالب کو اپنے توحیدِ خالص کے تصور پر بھی اصرار ہے۔

"...... مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نومسلموں کو ابو الائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحدِ خالص اور مومنِ کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ اور لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوا ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔"

(مرزا علاء الدین احمد خاں علائی کے نام)

اس اقتباس میں فلسفہ و تصوف کے مضمرات پر غور کرنے کے بجائے مکتوب نگار کے اخلاص پر توجہ مرکوز کرنی چاہئے۔ اخلاص کا یہی عنصر غالب کے ان اشعار کا مفہوم متعین کرتا ہے جو انہوں نے جنت کی حقیقت کے بارے میں رقم کئے ہیں۔ حسبِ ذیل اشعار اسی نکتے پر تاکیدی نشان لگاتے ہیں:

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

مطلب یہ ہے کہ عبادت گزاری اور نیکوکاری کا مقصودِ اصلی صرف رضائے الٰہی کا حصول اور دیدارِ خداوندی سے شادکام ہونا ہے، اس لئے کہ آخرت میں جزائے خیر کا منتہیٰ یہی ہے۔ غالب کا یہ تصورِ آخرت بالکل شریعتِ اسلامی کے مطابق ہے اور اس کے متعلق قرآن مجید میں واضح آیات موجود ہیں۔ اس تصور میں انکارِ جنت مضمر نہیں ہے، صرف "جنت کی حقیقت" نمایاں ہے۔ اپنے عقیدے کے اس خلوص کو غالب معرفتِ حق کا مترادف سمجھتے ہیں اور اسی کی بنا پر ایک شوخی کے ساتھ اپنے آپ کو "ولیِ پوشیدہ" کہتے ہیں۔ خواہ ظاہر پرست دنیادار انہیں "کافر کھلا" سمجھتے رہیں، گرچہ اپنی ولایت کے اعلان کو غالب نہایت خاکساری کے ساتھ خود ہی مشروط کر دیتے ہیں:

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اس قسم کے اشعار میں شاعر کا اشارہ اپنے عمل سے صرفِ نظر کر کے اپنی فکر کی اہمیت کی طرف ہے۔ اس اشارے کا تجسس کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ شاعر اپنے انحرافاتِ عمل کا اقرار کرنے کے باوجود اپنے فکری رویے کی استقامت پر نازاں ہے۔ اس سلسلے میں کلمۂ اسلام کے دونوں اجزائے ترکیبی توحید و رسالت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ وہ امتِ مسلمہ کا ایک فرد ہونے پر بھی فخر کرتا ہے۔

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود — قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں — یہ سوئے ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند — واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھلا

غالب کا حسبِ ذیل شعر اس ملی احساس کی تردید نہیں وہ اصل تائید کرتا ہے:

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم — ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اس شعر میں سارا زور "ترکِ رسوم" اور "اجزائے ایماں" پر ہے، نہ کہ ملتوں کے مٹنے پر۔ شاعر کا "موحد" ہونا اس زور پر مبنی ہے، ورنہ اس کے دعوی توحید کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہ جائے گا۔ ایمان ایک اصطلاحی لفظ ہے، جس کی ضد کفر ہے۔ غالب برملا ایمان بالغیب کے قائل ہیں اور اپنے اوپر کفر کا الزام لینے کے لئے تیار نہیں۔ ان کے اشعار اور مکاتیب دونوں اس واقعے پر قطعی دلالت کرتے ہیں۔

غالب کا یہ نظریاتی موقف ہی انہیں نجات کی توقع دلاتا، شرافتِ انسانی کی ضمانت دیتا اور ان کی جمالیات کو اخلاقیات سے یا اخلاقیات کو جمالیات سے ہم آہنگ کرتا ہے:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند — گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب — لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال — خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے — دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

ان اشعار میں "خیالِ حسن" کو "حسنِ عمل" کا مترادف یا بدل قرار دینے کے تخیل کا منبع و مرکز "خیالِ یار" ہے۔ شاعر کے ذہن پر یہ خیال ہر حال میں مسلط ہے اور اس کی ساری امیدیں

اسی سے وابستہ ہیں:

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے — کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

اسی قسم کے عاشقانہ اشعار کے تمام مضمرات و اشارات کے فہم کے لئے اس پس منظر کو مدنظر رکھنا ضروری ہے جس میں غالب نے شاعری کی۔ وہ ۱۷۹۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔ یہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی انقلاب کا عبوری دور تھا۔ قدیم تہذیب زوال پذیر تھی، جدید تہذیب نمودار ہو رہی تھی، تمدن بدل رہا تھا، معروف و مانوس اقدارِ حیات خطرے میں نظر آ رہی تھیں، حالات حوصلہ شکن تھے، لیکن غالب کا ذہن رجائی تھا اور اس کی تابِ مقاومت میر سے زیادہ تھی۔ وہ اپنی پسندیدہ تہذیبی قدروں کے پاس دار اور ان کے تحفظ کے علم بردار تھے، غیر ملکی اقتدار کے سامنے سپر انداز ہو کر اپنا ملی تشخص ترک کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، ایک ایسے اجنبی نظریۂ زندگی کی برتری انہیں تسلیم نہیں تھی جو ان کے معاشرے کو غارت کر رہا تھا۔ لہذا شاعر نے حال کے ابتلاء سے آگے بڑھ کر اپنی نگاہیں مستقبل پر جما دیں اور درستیِ احوال کے لئے نئی نسل سے ایک توقع قائم کی، پھر اس نسل کے مقدر کی تعمیر کے لئے ایک نشانِ راہ تجویز کرنا چاہا۔ لیکن غالب نہ مفکر تھے نہ مجاہد، وہ صرف ایک باشعور، حساس اور حوصلہ مند فن کار تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی مٹتی ہوئی تہذیبی قدروں کا ایک حسین نگارخانہ اپنے اشعار میں سجایا اور مشرقی اخلاقیات کا وہ مرقع ترتیب دیا جس کی کشش انیسویں صدی کے نوجوانوں کی دل کشی کا باعث ہوئی، اس مرقعے کے طلسماتی نقوش نے دلوں میں کچھ ولولے پیدا کئے، کچھ عزائم بیدار کئے اور کچھ جد و جہد کی دعوت دی، غیرت بھی دلائی، ہمت بھی بندھائی، عبرت کا سامان بھی کیا، مسرت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی بخشی۔

سب سے پہلے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ احوالِ زمانہ کا عکس غالب کے آئینۂ دل پر کس طرح

پڑا تھا اور انہوں نے اپنے معاشرے کی تباہی کس شدت سے محسوس کی تھی۔ مکاتیب کی حسبِ ذیل سطریں صورتِ حال اور اس کے متعلق شاعر کے ردِعمل دونوں پر روشنی ڈالتی ہیں:

"....... یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے! جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو۔"

(منشی ہرگوپال تفتہ کے نام)

"...... اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے، وہ دلی نہیں ہے جس میں شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے، وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے مسلمان اہلِ حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود۔"

(مرزا علاءالدین احمد خاں علائی کے نام)

"...... اور کی ناخوشی، راہ کی محنت کشی، تپ کی حرارت، گرمی کی شرارت، یاس کا عالم، کثرتِ اندوہ، غم حال کی فکر، مستقبل کا خیال، تباہی کا رنج، آوارگی کا ملال، جو کچھ کہو وہ کم ہے، بالفعل تمام عالم کا ایک سا عالم ہے۔"

(میر مہدی مجروح کے نام)

یہ سطریں ایک اجتماعی احساس کی غماز ہیں، ان میں صرف ایک شخص اور ایک شہر نہیں، پورے ملک، پورے معاشرے، پوری تہذیب اور سارے عالم کا ماتم ہے۔ یہ غالب کا عصری احساس ہے۔ اس عصر کا یہی پرتو مندرجہ ذیل اشعار پر بھی پڑا ہے:

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے، اور ماتم بال و پر کا ہے

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

نہ گلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

ایسی تباہی اور شکست و ریخت کے باوجود غالب پر یاس کا وہ عالم طاری نہیں ہوا جو ایک نسل پہلے میر پر ہوا تھا، صرف ایک تشکیک اور تامل نے غالب کے ذہن کا احاطہ کر لیا۔ وہ ایک شدید کشمکش اور تذبذب میں پڑ گئے:

ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

اس کشیدگی کو شاعر کی مشکل پسندی نے دور کیا اور اس کے اعتقاد نے بالآخر اسے پیچیدگی سے نکلنے کا راستہ دکھایا:

بہ فیضِ بے دلی نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشایش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

"کشایش" کا لفظ قابلِ غور اور فکر انگیز ہے۔ یہ "ہمت دشوار پسند" کا اشارہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسی نادیدہ قوت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جو مشکل کشا ہے اور ہر دور میں انسان کے مسائل کی عقدہ کشائی کرتی رہی ہے۔ یہی قوت شاعر کی آرزوؤں کا مرکز ہے، وہ اس پر ایمان رکھتا ہے، اعتماد کرتا ہے اور اس سے حلِ مسائل کی توفیق طلب کرتا ہے، اس لئے کہ اس کے

وہ دل شوریدہ ،، میں جو ،، طلسم پیچ و تاب ،، ہے وہ محبوب ازل کی تمنا کے سبب ہے یہی تمنا درحقیقت وہ شعلہ ہے جس سے ساری تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں۔ معشوق حقیقی کی آرزو شاعر کے رگ و پے میں سمائی ہوئی ہے ، وہ اس لافانی ہستی سے شکوہ بھی کرتا ہے اور توقع بھی رکھتا ہے۔ شاعر کی شوخی بھی اسی ذات باری تعالیٰ کے ساتھ ہے اور جواب دہی بھی اس کے لئے :

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خون جگر ودیعت مژگانِ یار تھا

ویداد ہے بیداد دوست جاں کے لئے
رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لئے

اپنے مرکز امید و آرزو کے لئے شاعر کے احساسات کی لطافت ، جذبات کی گہرائی اور خیالات کی بلندی کا کچھ اندازہ ذیل کے اشعار سے ہوتا ہے :

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

غالب کے یہ الہیاتی تصورات اور صوفیانہ خیالات ان کی روحانی حسیات اور ملی احساسات سے وابستہ اور ان پر دلالت کرتے ہیں۔ ان حسیات و احساسات میں بڑی شدت اور گہرائی ان حالات کے سبب پیدا ہو گئی جو سیاسی اور تمدنی سطح پر شاعر اور اس کی نسل کو درپیش تھے۔ یہ نسل دیکھ رہی تھی کہ جن معاشرتی اصولوں اور تہذیبی قدروں پر اس کی پرورش ہوئی تھی اور جو اس کے مزاج و خمیر میں داخل ہو کر اس کا ذہن و ضمیر بن چکی تھیں سخت خطرے میں ہیں اور اگر وہ فنا ہو گئیں تو زندگی کا کوئی مفہوم ، کوئی مقصود باقی نہیں رہ جائے گا :

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

یہ سوال ایک عالم اضطرار میں شاعر کے لب پر آیا اور حد درجہ پریشان کن تھا۔ ایک سراسیمگی کی کیفیت اس پورے معاشرے پر طاری تھی جس سے شاعر کا تعلق تھا۔ تہذیب مشرق بحران میں مبتلا تھی :

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

یہ صورت حال غالب کے ایمان و آگہی اور تمکین و ہوش کے لئے ایک چیلنج تھی ، جس کا جواب ان کی غیرت و ہمت نے اس شان سے دیا :

وفاداری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

تاب لائے ہی بنے گی غالب
حادثہ سخت ہے اور جان عزیز

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُرگل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

مطلب ہے "وفاداری بہ شرطِ استواری" اپنے معاشرے اور اس کی قدروں کے ساتھ، جن پر گزرنے والے حوادث سخت ہونے کے باوجود ان کی "تاب" لانی ہی ہے اور ہر حال میں اپنی "انجمن آرزو" کے اندر ہی سانس لینا ہے، چنانچہ کچھ دن اور اگر "زندگانی" ہے تو اپنے جی میں اپنی تہذیب کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو پورا کرنے کی ٹھان لیتی ہے، کم ہمتی سے وقت کی یلغار کے سامنے سپر انداز ہو کر "انفعال" کو راہ نہیں دینی ہے، خطرات کے درمیان بہت زیادہ "وضعِ احتیاط" سے دم گھٹ سکتا ہے، اس لئے وقت آگیا ہے کہ "گریباں" چاک کیا جائے اور ایک جنوں کے ساتھ "وادیٔ پرخار" میں قدم رکھ کر اپنی آبلہ پائی سے سوکھے ہوئے کانٹوں کی زباں بھی تر کی جائے، مقتل میں اس نشاط سے اترا جائے کہ "پُرگل خیال زخم سے دامن نگاہ کا" ہو۔ اس معرکۂ حق و باطل میں اگر جان بھی چلی جائے تو مضایقہ نہیں:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غالب کا یہ عزم و حوصلہ محض خواب اور جوش کی بات نہیں تھی، بہت سوچا سمجھا ہوا فیصلہ تھا۔ وہ "ہجوم ناامیدی" میں بھی ایک "سعیٔ بے حاصل" کی لذت اس لئے لے رہے تھے کہ اپنی تہذیب، عقاید اور اقدار کے وفاداروں کے "جنوں کی حکایات خوں چکاں" لکھتے رہیں:

بس ہجوم ناامیدی! خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیٔ بے حاصل میں ہے

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

شاعر نے یہ سب کچھ ایک "گرمیٔ نشاطِ تصور" سے سرشار ہو کر کیا، تاکہ اس کی نواسنجی مستقبل کے "گلشن ناآفریدہ" کی تخم کاری کر سکے اور ہندوستان کی آیندہ نسلیں اس گلشن کی سیرابی و شادابی کا سامان کریں:

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشنِ ناآفریدہ ہوں

انیسویں صدی کے عندلیب گلشن ناآفریدہ نے جس تہذیب اور معاشرے کے لئے نغمہ سنجی کی وہ اپنے وقت کی قومی تہذیب تھی، ملکی معاشرہ تھا اور اس کی زبان اردو تھی جس کے مختلف نام تھے، ہندی بھی اس کو کہتے تھے، ہندوی، ہندوستانی اور ریختہ بھی، خود غالب نے اپنے آپ کو ریختہ کا ایک استاد کہا اور اپنے خطوط کے ایک مجموعے کا نام "اردوئے معلّٰی" رکھا تو دوسرے کا "عود ہندی"۔ اس تہذیب کی بارگاہ ان کے لئے "آستانِ یار" تھی جس سے اٹھنے اور جس کو چھوڑنے کا تصور موجِ خوں کے سر سے گزر جانے کا لرزہ خیز نقشہ دکھاتا تھا، یہی تہذیب شاعر کا وہ کعبہ تھا جس سے اس کی پشت لگی ہوئی تھی اور جو اس کی ہر خواہش و کوشش کی پشت پر تھا، چنانچہ آگے سے اسے کھینچنے والے کلیسا کا کوئی اثر اس پر نہیں ہوتا تھا، اس لئے کہ معاملہ کفر و ایمان کے مقابلے کا تھا اور غالب بے ایمان نہیں تھے، ایمان فروش نہیں تھے، نہ ہو سکتے تھے، نہ کبھی ہوئے، وہ تو اسی ایمان کے لئے دار و رسن کی آزمائش میں پڑے ہوئے تھے اور وفاداری بہ شرطِ استواری کو اس حد تک اصل ایمان سمجھتے تھے کہ اپنے عقیدے کی پختگی کے ساتھ مرنے والے برہمن کو بھی کعبے میں دفن کرانے کے لئے تیار تھے، وہ ہر حال میں حق کے طرفدار تھے علم بردار تھے اور اس پر جان نچھاور کرنے کو بھی ایک معمولی بات تصور کرتے تھے۔ اپنی تمناؤں کی بے تابی کے باوجود غالب عاشق کی صبر طلبی کو گوارا کر رہے تھے اور خونِ جگر کی منزل پر پہنچنے تک اپنے دل کو ہر رنگ میں رکھنے کی سعی کر رہے تھے، وہ جانتے تھے کہ نیشِ عشق کے گوارا ہونے کے لئے

ایک عمر چاہیے اور لذتِ زخم جگر ایک دو دن کی بات نہیں، شاعر ایک عاشق صادق تھا اور اپنی ذات کو عشق کے سیلاب بلا کا مرکز سمجھتا تھا، جس کے ٹوٹنے کے بعد سے یکسئ عشق کا اندیشہ تھا، وہ اپنے دور میں گویا شمع عشق کی طرح جل کر بزم محبت کو روشن کئے ہوئے تھا، جس کے بجھ جانے پر شعلۂ عشق کے دھواں بن کر اڑ جانے اور سیہ پوش ہو جانے کا خوف تھا، غالب کو احساس تھا کہ اپنے وقت میں وہ مے مردافگن عشق کے تنہا حریف ہیں اور ان کے بعد یہ صدا بلند ہوگی:

کون ہوتا ہے حریفِ مے مردافگنِ عشق! — لب ساقی پہ مکرر ہے صلا میرے بعد!

یہ ہیں غالب کے اخلاقی نقطۂ نظر کے تار و پود اور ساز و برگ۔ اس نقطۂ نظر کے حقائق کو دیکھتے ہوئے بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ غالب رند نہیں تھے، قلندر تھے اور ان کی وسیع المشربی کا راز یہی قلندری ہے، نہ کہ رندی۔ شاعر کی ساری اعلیٰ ظرفی اور رواداری اسی قلندری پر مبنی ہے۔ اسی کی بدولت غالب کی اخلاقیات ایک وسیع ترین تہذیبی دائرے کی نشاندہی کرتی ہیں۔ شاعر کے کردار کی شائستگی اس کی تہذیبی قدروں ہی کی مرہون منت ہے۔ اس شائستگی کے خلاف جو روایات پھیلائی گئی ہیں وہ کچھ تو محض افواہیں ہیں جن کی کوئی بنیاد نہیں اور کچھ شاعر کے استعاراتی بیانات کی غلط ترجمانی ہے۔ شاعر کی شراب نوشی، جوابازی اور شاہد بازی میں غیر ضروری اور نامعقول مبالغہ آرائیاں کی گئی ہیں، غالب کو پارسائی کا دعویٰ نہیں ہے اور نہ ان کے شیدائی ان کے زہد و تقویٰ کی قسمیں کھاتے ہیں۔ لیکن جس بات پر غالب کے قدرشناسوں کا اصرار ہے وہ ان کی انسانی شرافت، خوش خلقی اور مروت ہے۔ وہ یقیناً ایک "آزادہ و خود بیں" انسان تھے، مگر ان کی ساری آزادی و خودبینی ان ارباب اقتدار یا درباریوں کے مقابلے میں تھی جو اپنی آقائی کے غرور میں دوسروں کو "بندگی" کی زنجیر میں باندھنا چاہتے تھے۔ غالب کو "شہ کا مصاحب" بننے کی تمنا نہیں تھی، نہ وہ شہر میں اتراتے پھرتے تھے۔ شاعر اپنی بعض

عادتوں سے مجبور ضرور تھا جن کا تعلق اس کی ذات تک محدود اور ایک حد کے اندر تھا، غالب کی زندگی میں بدمستی کا سراغ نہیں ملتا، ان پر جوئے کا الزام بھی بہت ہلکا تھا اور ان کی شاہد بازی میں بے راہ روی کا نشان مفقود ہے۔ اپنی معاشی ضرورتوں کے لئے اقتدار وقت سے ان کا تعلق اپنے حقوق کے بقدر ہی تھا خواہ یہ تعلق مغلیہ دربار سے ہو یا برطانوی سرکار سے۔ اس تعلق میں بھی غالب کو خودداری عزیز تھی اور یہ عزت نفس وقتی تنگی سے بھی بڑھی ہوئی تھی کہ جو کچھ ملے بھی، اگر وہ ان کے لئے وقار کے ساتھ روا نہ ہو سکے، اسے پھیرنے کا حوصلہ وہ رکھتے تھے۔

شاعر نے حتی الوسع اپنی آبرو کا سودا نہیں کیا اور اس لئے بہت زیادہ اس کی صلاحیت رکھنے کے باوجود قصیدہ نگاری کو اپنے عرض ہنر کا میدان نہیں بنایا، خواہ بعض اوقات اس صنف سخن میں رنگ زمانہ کے مطابق اور کچھ موقع کی مناسبت سے انہیں کچھ کہنا پڑا ہو۔ ریاست غالب کو ورثے میں ملی تھی مگر وہ اس کی نمائش دیگر رؤسا و امراء کے مقابلے میں احتیاج کے باوجود اپنی خودداری کے اظہار سے زیادہ نہیں کرتے تھے۔

ان حقائق کے باوجود جو ناقدین یا محققین غالب کے اشعار یا خطوط میں نفسی انحرافات کی جستجو کرتے ہیں یا شاعر و ادیب کی تحلیل نفسی کر کے چند نفسیاتی مزعومات کے دلائل تلاش کرنا چاہتے ہیں انہیں غالب خود ہی تنبیہ کرتے ہیں:

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اب غالب کے اشعار میں چند سبق آموز اخلاقی نصیحتیں بھی ملاحظہ ہوں:

نہ سنو، گر برا کہے کوئی — نہ کہو، گر برا کرے کوئی

روک لو، گر غلط چلے کوئی — بخش دو، گر خطا کرے کوئی

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے — کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے — جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

ہاں بھلا کر، ترا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے!

لیکن وعظ و پند غالب کا شیوہ نہیں، نہ وہ ناصح مشفق بننے پر آمادہ ہیں۔ ان کے نیک مشورے یا تو ان کے نیک ارادے ہیں اور ان کی اخلاقی حیات پر تاکیدی نشان لگاتے ہیں یا ان اخلاقی قدروں کی تائید و تحسین پر مشتمل ہیں جو غالب کے معاشرے میں مروج تھیں اور انہیں تہذیب کے لوازم سمجھا جاتا تھا، یعنی شاعر اپنی انفرادیت کے باوصف زبان خلق کی ہم نوائی کر رہا تھا، اس لئے کہ اس کی ساری جدتیں صرف اپنی روایات کی توسیع کے لئے تھیں، ان میں تبدیلی کے لئے نہیں، اپنے سماج کی ترقی کے لئے تھیں اس میں کسی بنیادی تغیر کے لئے نہیں! بات یہ ہے کہ فکر و عمل کی تازگی اور درستی احوال کے لئے غالب کا انداز نظر انقلابی نہیں اصلاحی تھا۔ ارتقائے حیات اور عروج انسانیت کے متعلق غالب کے چند اشعار کا مطالعہ ذہنی شاعر کے انھی حقائق کی روشنی میں کرنا چاہیئے:

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے — میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب — ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

مسلسل اور بے انتہا ترقی کا یہ تصور غالب کے اخلاقی نقطۂ نظر کا نقطۂ عروج ہے۔ وہ صاحب کمال بھی تھے اور طالب کمال بھی، خوب سے خوب تر کی جستجو ان کا مطمح نظر تھا، ان کی مشکل پسند طبیعت اور ان کے پیہم اضطراب کا راز بھی یہی ہے۔ ان کی نا آسودگی اور بے اطمینانی کا سبب یہی ہے۔ فکر اور فن دونوں میں دشوار گزار راہوں کے سفر اور زیادہ سے زیادہ وسعت و رفعت کی طلب کا باعث بھی یہی ہے:

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

بہ قدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل — کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

کہا جا سکتا ہے کہ یہ تلاش حق یا جستجوئے حقیقت کا ایک والہانہ انداز ہے۔ غالب سمجھتے ہیں کہ زندگی کے تمام مسائل کا حل وہ موت ہے جس کے بعد ایک نئی اور بہتر زندگی ہے اور زندگی میں مطلق ترقی کا امکان یہاں تک ہے کہ نگاہ امید جلوۂ محبوب کے لئے عرش سے پرے بھی دیکھ سکتی ہے:

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب — کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

منظر اک بلندی پہ اور ہم بنا سکتے — عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

تلخیص و تبصرہ

انڈونیشی زبان پر عربی زبان کے اثرات

متحدہ عرب امارات کے موقر ہفتہ وار جریدہ "الاصلاح" میں انڈونیشیا کے ایک حسینی کا مختصر مضمون، عنوان بالا کے تحت شائع ہوا ہے، قارئین کی دلچسپی کے لئے اس مفید مضمون کی تلخیص قدرے اضافہ و ترمیم کے بعد پیش کی جاتی ہے۔ (عمیر الصدیق)

دنیا کا سب سے بڑا مجمع الجزائر انڈونیشیا ۱۳۶۷۷ جزیروں پر مشتمل ہے، ان میں نصف سے زیادہ جزیرے بے نام ہیں اور صرف ایک ہزار جزیروں میں انسانی آبادی ہے، باقی جزیرے ابھی تک وجود آدم کے منتظر ہیں۔

سماترا، جنوبی بورنیو، ایریانا، جاپا، سلاویسی، جاوا اور مدورا یہاں کے بڑے جزیرے ہیں، پورے ملک کی آبادی ۱۶۵،۰۸۷،۰۰۰ ہے، ان میں نوے فیصد سے زیادہ مسلمان ہیں، یہاں کی عام اور سرکاری زبان کا نام مالے MALAY یا بہاسا انڈونیشیا BAHASA INDONESIA ہے۔

انڈونیشیا زمانہ قدیم سے گرم مسالہ کی پیداوار کے لئے مشہور رہا ہے، جائفل، لونگ، سیاہ مرچ اور دارچینی کی خوشبو نے کئی اجنبی قوموں کو اس کی جانب متوجہ کیا۔

جب عرب اور ہندوستان کے مسلمان تاجر یہاں آئے تو اسلام کی سوغات بھی اپنے ساتھ لائے، سب سے پہلے شمالی سماترا کے لوگوں کو ایک عالم شیخ عبد اللہ عارف کی بدولت

اسلام قبول کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، یہ بارہویں صدی عیسوی کا واقعہ ہے، پھر شیخ کے ایک شاگرد رشید شیخ برہان الدین نے شمالی اور جنوبی سماترا میں تیزی سے اسلام کی دعوت عام کی، چودہویں صدی میں حجاز سے شیخ اسمٰعیل اپنے رفقاء کے ساتھ تبلیغ اسلام کے لئے آئے، اسی صدی میں شیخ مالک ابراہیم مغربی اور ان کے ساتھی مبلغین کے ذریعہ جاوا میں بھی دعوت اسلام کو فروغ حاصل ہوا۔

سنہ ۱۳۴۶ء میں جب ابن بطوطہ سماترا آیا تو اس وقت سلطان زین العابدین الملک الظاہر تخت سلطنت پر متمکن تھا۔

یہاں کے باشندوں کے طور طریقے، رسم و رواج اور زبان کے لہجے جدا جدا ہیں لیکن مذہب اسلام نے سب کو ایک ہی رشتہ میں پرو رکھا ہے۔

انڈونیشیا کی زبان پر عربی زبان کے گہرے اثرات و نقوش عجیب حیرت انگیز ہیں، اس کے باشندوں کے نام عموماً عربی ہوتے ہیں اور اس میں مسلم و غیر مسلم کی کوئی تخصیص بھی نہیں ہے۔ احمد، محمد، محمود، عبد الحمید، حمیدہ، محمودہ، جمیلہ وغیرہ نام عام طور سے ملتے ہیں، جاکرتا میں پارلیمنٹ کی بلند و بالا عمارت کے صدر دروازہ پر D.R.P کے حروف منقش ہیں یہ حروف دیوان رعیہ فر واکیلان DIWAN PERWAKILAN RAYAT کا اختصار ہیں، دیوان اور رعیہ کی عربیت ظاہر ہے، اسی طرح ایک ادارہ M.R.P کے نام سے مشہور ہے، یہ اختصار مجلس فر مشاورا تان رعیہ MAJLIS PERMUSY AWARATAN - RAYAT کے عربی الفاظ سے ماخوذ ہے، یہ مثالیں ایک سرسری جائزہ پر مبنی ہیں، اگر قدیم انڈونیشی ادب کا جائزہ لیا جائے تو اس میں بے شمار عربی الفاظ و اصطلاحات کا ذخیرہ ملے گا۔

علامہ سوتان محمد زین اور شیخ و، ی، س، پ، وادرمنطا کی تحقیق کے مطابق عربی کے مفرد الفاظ

اس کثرت سے ہیں کہ انڈونیشی لغت کا نصف حصہ ان ہی پر مشتمل ہے، ان الفاظ کو چار قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ایسے الفاظ و معانی جو اصل عربی زبان کے ہو بہو مطابق ہیں (۲)۔ وہ الفاظ جو صوتی لحاظ سے کچھ مختلف ہیں لیکن ان کے معنی اصل کے مطابق ہیں (۳) عربی الاصل الفاظ و معانی کی تحریف شدہ شکلیں (۴) وہ الفاظ جو اصل عربی زبان کے مطابق ہیں لیکن ان کے معنی تبدیل ہو گئے ہیں۔

پہلی قسم کی چند مثالیں یہ ہیں:

اخبار AKHBAR، اخلاق AKHLAQ، ابلیس IBLIS، ارواح ARWAH

اصل ASAL، امۃ UMMAT، بخیل BAKHIL، بلیغ BALIGH، دلیل DALIL، دولۃ DAULAH، دعوۃ DAKWAH، فجر FAJAR،

رعیۃ RAYAT، جبریل JIBRIL، لسان LISAN، خصوص KHUSUS،

خیانۃ KHIYANAH، حبیب CHABIB، فقیر FAQIR، جہاد JIHAD،

نبی NABI، عمر UMAR، عموم UMUM، تکبر TAKABBUR، صلاۃ SHOLAT، مجلس MAJLIS، مسافر MUSAFIR، موجود MAUJUD،

مدرسہ MADROSAH، کافر KAFIR، منافق MUNAFIQ، مومن MUKMIN،

جدول JADWAL، فلک FALAK، احد ACHAD، عبد ABDI

صوتی اعتبار سے مختلف ہونے کے باوجود جن لفظوں کے معنی اصل عربی الفاظ کے مطابق ہیں ان کی کچھ مثالیں یہ ہیں:

برکۃ BERKAT، خبر KABAR، ظاہر LAHIR، ظہور LUHUR،

مضرۃ MUDARAT، سلامۃ SELAMAT، وباء WABAH، ماء الورد MAWAR

رضا RELA، لغۃ LOGAT، صدقۃ SEDEKAH، موافقۃ MUFAKAT،

ممکن MUNGKIN، صحیح SYAH،

جن الفاظ کی صوتی و معنوی اصلیت میں تحریف ہو گئی ہے ان میں قصیدہ، قول جیسے الفاظ ہیں، چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

اعتقاد IKTIKAT، عربی میں عقیدہ، انڈونیشی میں معرفت، خاطب KATIB، عربی میں مقرر، خطیب اور انڈونیشی میں محرر، شہادتین SEKATAN، عربی میں کلمۂ شہادت اور انڈونیشی میں محفل ذکر میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

وہ الفاظ جو اصل زبان کے مطابق ہیں لیکن معنی میں مطابقت نہیں ہے، ان کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

کلمۃ KALIMAT، عربی میں حروف سے مرکب ایک لفظ اور انڈونیشی میں جملہ مفیدہ، استاذ USTADZ عربی میں کسی ایک فن کا ماہر سمجھا، انڈونیشی میں تعلیم دینے والا ہر شخص، معلم MUALLIM، عربی میں مدرس اور انڈونیشی میں کشتی ران یا ناخدا، دفتر DAFTR، عنکبوت KALANGKABUT وغیرہ بھی اسی قسم کے الفاظ ہیں۔

ان چند مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تقریباً نو سو سال کے عرصہ کے بعد بھی انڈونیشی زبان پر عربی زبان کے گہرے اثرات باقی ہیں، علاوہ ازیں ان میں اسلام کے عقیدہ و شریعت کی روح بھی برقرار ہے لیکن موجودہ دور میں دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح انڈونیشیا پر بھی مغربی افکار و نظریات اور زبان و تہذیب کا غلبہ و تسلط ہے۔ اس نے سیاسی حیثیت سے ضرور آزادی حاصل کر لی ہے مگر لسانی اور تہذیبی تسلط سے ابھی نجات نہیں حاصل کر سکا جو اگرچہ ضروری ہے لیکن اس کے لئے بہت زیادہ محنت، جدوجہد اور قربانی کی ضرورت ہے۔ (ع۔ ص)

اخبارِ علمیّہ

پاکستان کے اردو ادارہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے امسال کی پہلی ششماہی میں اٹھارہ کتابیں شائع کی ہیں جو دفتری اردو، عدالتی اردو، تعلیمی اردو اور تحقیقی و حوالہ جاتی امور سے متعلق ہیں، ان کتابوں کی نوعیت و اہمیت ان کے نام سے ظاہر ہے، مثلاً اقسام تحریری دفتری، مسل بندی (مسل برداری)، اسلوب دفتری زبان، کشاف قانونی اصطلاحات، اساسیات قدیم کیمیا، کتابیات صنعتی فنون، اردو میں زرعی کتب وغیرہ۔

تحقیق میں مرزا جعفر علی خاں اثر مرحوم کی مشہور لغت فرہنگ اثر کو چھوٹی عکسی طباعت میں شائع کیا گیا ہے، لسانیات میں لسانی مقالات اور اردو رسم الخط کے بنیادی مباحث کے نام سے دو عمدہ کتابیں بھی شائع کی گئی ہیں۔

چھ مہینوں میں اٹھارہ عمدہ اور مفید کتابوں کا شائع ہونا کسی ایک ادارہ کی حسن کارکردگی کی بین دلیل ہے۔

پاکستان کے ایک علم دوست لطف اللہ خاں صاحب نے اپنے ذاتی شوق کو ایک حیرت انگیز کارنامہ میں بدل دیا ہے، انھوں نے دس ہزار سے زائد آوازوں کے کیسٹ کی ایک لائبریری تیار کی ہے جسے آوازوں کے عجائب گھر سے تعبیر کیا جا رہا ہے، ان میں ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے اہم اشخاص کی آوازیں محفوظ کی گئی ہیں، آئندہ زمانہ میں محققین ان آوازوں سے صاحب آواز کی شخصیت، سن و سال اور مزاج و طبیعت کا جائزہ لے سکیں گے، ابتک تیس لاکھ فٹ سے زیادہ ریلوں میں یہ صدا بندی ہو چکی ہے، ان کیسٹوں کی کیٹلاگنگ

بھی حیرت ناک ہے، جس میں صاحب آواز کا نام حروف تہجی کے لحاظ سے درج ہے، آواز کب اور کس موقع پر بھری گئی اور یہ کتنے منٹ اور سکنڈ کی ہے، اس کی بھی تفصیل ہے، ہر فرد کے شخص کے کیٹلاگ اور ٹیپ الگ الگ ہیں۔

امریکا کی کانگریس لائبریری میں ۱۴ ملین یعنی ایک کروڑ چالیس لاکھ کتابیں ہیں جن کی حفاظت کے لئے جدید ترین دوائیں استعمال کی جاتی رہی ہیں، مگر اخبار واشنگٹن پوسٹ نے لائبریری کے ذمہ داروں کے حوالہ سے یہ خبر دی ہے کہ ان تیز کیمیاوی اور تیزابی دواؤں کا بُرا اثر کتابوں پر ہوا ہے اور تقریباً ایک چوتھائی حصہ برباد ہو گیا ہے، صفحات بوسیدہ ہو گئے ہیں اور ورق گردانی سے اوراق کی شکست کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے، اندیشہ ہے کہ اور کتابیں بھی زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوں گی، ذمہ داروں نے آگاہ کیا ہے کہ اگر مزید تاخیر کی گئی تو اس عظیم الشان کتب خانہ کی تقریباً ستانوے فیصد کتابیں ورق ورق ہو جائیں گی۔

جنوبی افریقہ کے ایک سابق فزیکل سائنس ٹیچر فیض الحافظی کی قوت اختراع نے اسلام کے متعلق تاریخی و تحقیقی معلومات کو بہت دلچسپ طور سے پیش کیا ہے، انھوں نے ایک بورڈ گیم ایجاد کیا ہے جسے اسلامک کوئیسٹ یا آئی کیو کے نام سے بڑی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے، اس کھیل کے ذریعہ سے اسلام کے بارہ میں معلومات حاصل ہونے کے علاوہ اس سے دلچسپی اور تعلق میں اضافہ ہوتا ہے، فیض الحافظی نے ایک سال کی محنت و تحقیق کے بعد اس دلچسپ اور کارآمد کھیل کی ایجاد میں کامیابی حاصل کی۔

نظام شمسی کی بے کراں وسعت کے بارے میں جدید سائنس ہر روز نئے انکشافات کرتی ہے اور گذشتہ مفروضوں کو خود ہی غلط اور ناقص ثابت کرتی جاتی ہے، روسی سائنسدانوں نے دمدار ستاروں سے متعلق ۱۹۸۶ء میں ایک تحقیقاتی مشن روانہ کیا تھا، اس کی اطلاعات

سے اب یہ نتیجہ نکلا کہ نظام شمسی کے ارتقاء، ظہور واقعات اور حقائق سے متعلق اب تک جو تصورات و نظریات قائم کیے گئے تھے ان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، نظام شمسی اب تک کے اندازوں سے کہیں زیادہ عظیم و ثقیل ہے، دمدار ستاروں سے مادہ کے زبردست اخراج کے بعد اب ان ستاروں کی جسامت کے متعلق سائنسدانوں کی رائے بالکل بدل گئی ہے، ابتک عام خیال یہ تھا کہ ان ستاروں کا قطر یا دائرہ دو کلومیٹر کا ہوتا ہے لیکن ویگا مشن کی اطلاعات سے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ یہ دمدار ستارے کہیں زیادہ بڑے اور وزنی ہیں،

قدیم یونان کے جنگی دیوتا اور جلاد فلک مریخ ماہ ستمبر ۱۹۸۸ء میں سترہ برس کے بعد پہلی مرتبہ زمین کے سب سے زیادہ قریب آیا، گو اس قربت میں بھی ۵۷ ملین کلو میٹر کا فاصلہ تھا، ۲۲ ستمبر کو یہ زمین سے سب سے زیادہ قریب ہوا، مشتاقانِ دید نے اس کے دیدار کا عزم کیا، سائنسدانوں نے پہلے ہی اطلاع دی تھی کہ آسمان کے جنوب مشرق میں نہایت روشن سنگترہ کی شکل میں ۲۲ ستمبر کے بعد بھی کئی دنوں تک اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔

کیرالہ کے شہر ترویندرم کے شہریوں کو ایک انوکھی نمائش دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں دنیا کے ساٹھ ملکوں کے تقریباً چار سو اخبارات کو ایک ساتھ پیش کیا گیا، ان میں دنیا کے سب سے بڑے اخبار جاپان کے اساہی شمبن کے علاوہ برطانیہ کے مشہور قدیم اخبارات دی ٹائمز اور دی آبزرور بھی تھے

اس نمائش کا انعقاد ہندوستان کے سب سے کثیر الاشاعت ملیالم اخبار روزنامہ ملیالم منورما کی صد سالہ تقریبات کے سلسلہ میں کیا گیا۔

یورپ کا مرد بیمار "ترکی" ایک بار پھر اپنی فراموش کردہ اسلامیت کی جانب رواں ہے، اس کے وزیر اعظم ترغت اوزال عثمانی خلافت کے بعد پہلے سربراہ حکومت ہیں جنھوں نے اس سال فریضۂ حج ادا کیا، ترکی اور بیرون ترکی میں سیکولر حلقوں کو ظاہر ہے یہ ادا پسند نہیں آئی، چنانچہ

ایک برطانوی ہفت روزہ نے اس سفر حج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس سے کمال اتاترک کی روح کو دوسرے جہاں میں یقیناً اذیت ہوئی ہوگی۔

یورش تاتار کا افسانہ پرانا ہو چکا ہے لیکن صنم خانوں سے پاسبان کعبہ آج بھی مل رہے ہیں معاصر امپیکٹ لندن کی ایک خبر کے مطابق فرانس کی کمیونسٹ پارٹی کے بانی ایم تھوریز کے ایک بیٹے اور بیٹی نے اسلام قبول کر لیا، نو مسلم صاحبزادے کا نام عبد الرحمٰن تھوریز رکھا گیا ہے، اسلام کی یہ نعمت ان کو فرانسیسی زبان میں قرآن مجید کے ایک ترجمہ کے مطالعہ کے بعد نصیب ہوئی۔

مغرب کی وادیوں میں پھر اذانیں گونج رہی ہیں، اس سلسلہ میں رابطہ عالم اسلامی مکۃ المکرمہ کی کوششوں کا بھی بڑا دخل ہے، چنانچہ حال ہی میں اس کے سکریٹری جنرل عبد اللہ عمر نصیف نے پولینڈ کا دورہ کیا جو یورپ میں اشتراکیت کا ایک بڑا مرکز ہے، بایں ہمہ اس سرزمین پر ابھی تک اسلام کا نام و نشان باقی ہے چنانچہ مسلمانوں کی ایک تنظیم مسلم ریلیجس یونین کے نام سے قائم ہے، عبد اللہ عمر نصیف نے اس کے ذمہ داروں سے ملاقات کی اور مسجدوں کی تعمیر، تہذیبی مرکزوں کے قیام، نوجوانوں کی مذہبی تعلیم کے بندوبست، دینی کتابوں کی اشاعت نیز حج وغیرہ کے مسائل پر گفتگو کی، انہوں نے راجدھانی وارسا میں ان مقامات اور اداروں کا بھی معائنہ کیا جن کا تعلق اسلام اور اسلامی تہذیب سے ہے۔

برطانیہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور مسیحا نفسی پر ایک فلم THE LAST TEMPTATION OF CHRIST (حضرت عیسیٰ کی آخری ترغیب) کے نام سے بنائی جا رہی ہے، انبیاء کرام کی معصوم و مقدس زندگیوں کے بارہ میں اس قسم کی فلمیں بنانا ان کی سخت توہین اور گستاخی کا باعث ہے"

(ع - ص)

آثار علمیہ و ادبیہ

مولانا حمید الدین فراہیؒ کی ایک غیر مطبوعہ فارسی نظم

از

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، اسلام آباد، پاکستان

سب سے پہلے نظم ملاحظہ فرمائیے۔

"بنام خدائے بخشائندہ مہرباں"

بنام آں کہ آغاز ست و پایاں ۱ خدائے کاشکارا ہست و پنہاں

فروغِ آسمانہا و زمین ست ۲ چراغِ دیدۂ ہر پاک بین ست

ندارد ہیچ ہمتائے نہ مانند ۳ نخواہد نیز انبازے نہ فرزند

اگرچہ پاک از ہر زیر و بالاست ۴ بہر سوئے کہ رو کردی ہم آنجاست

جہاں را بہر جاں بنیاد کردہ ۵ سپس جاں را بہوش آباد کردہ

تن و جان و خرد چوں نردبانیست ۶ جہانے در جہانے در جہانیست

چو خاکِ جانِ تو گردید ہموار ۷ درو تخمِ خرد افگند یکبار

مگر جانِ تو خاکِ آتشیں ہست ۸ درو تخمِ خرد آتش نشیں ہست

چو جاں را با خرد داد آشنائی ۹ ازیں آتش بر آمد روشنائی

چگونہ لالہ روید از دلِ خاک ۱۰ ز جانت سر زند ہم گلشنِ پاک

ہر آنکہ جانور ست و نا خردمند ۱۱ ازاں گلشن بنامی گشتہ خرسند

زشیر و انگبیں و نار سیبے ۱۲ چو کودک دل نہادہ بر فریبے

فروغِ ہوش خود بنمودہ زیباست ۱۳ کہ جاں یک دوزخ از گرمی تہاست

اردو ترجمہ:

ابتدا کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو غفور الرحیم ہے

۱۔ ابتدا کرتا ہوں اس کے نام سے جو اول بھی ہے آخر بھی ہے اس خدا کے نام سے جو ظاہر بھی ہے اور نہاں بھی ہے

۲۔ وہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے وہ ہر پاک نظر والے کی آنکھ کا چراغ ہے

۳۔ اس کا کوئی ہمسر ہے نہ مثیل ہے۔ اس کو شریک اور بیٹے کی بھی ضرورت نہیں

۴۔ وہ اگرچہ ہر پست و بلند (کی حد بندی) سے بری ہے (اس کے باوجود) تم جس طرف بھی رخ کرو گے اس کو موجود پاؤ گے۔

۵۔ اس نے روح کے لئے دنیا بنائی اس کے بعد روح کو عقل سے آباد کیا

۶۔ جسم اور روح اور عقل ایک سیڑھی کی مانند ہیں ایک جہاں کے اندر (دوسرا) جہاں اور اس کے اندر ایک (تیسرا) جہاں[1]

۷۔ جب تمہاری روح کی مٹی ہموار (تیار) ہو گئی تو اس میں یکبارگی خرد کا بیج بو دیا

۸۔ مگر (یہ نہ بھولو کہ) تمہاری روح ایک ایسی مٹی ہے جس کا خمیر آگ سے تیار ہوا ہے اور اس کے اندر جو خرد کا بیج ہے اسے آگ میں رکھا گیا ہے۔

۹۔ جب روح کو عقل کی آشنائی سے نوزا تو اس آگ سے روشنی نکلی

۱۰۔ جس طرح مٹی کے دل سے لالہ اگتا ہے تمہاری روح سے بھی پاکیزہ گلستان نمودار ہوتا ہے

۱۱۔ ہر وہ مخلوق جو ذی روح ہے لیکن عقل سے محروم ہے وہ اس گلستاں میں نمو پانے والی (اشیاء) سے خوش ہو جاتا ہے۔

---

[1] یکے بعد دیگرے درجہ بدرجہ یہ تین جہان ہیں گویا۔

۱۲۔ دودھ اور شہد اور انار اور سیب کو دیکھ کر — وہ بچے کی طرح دھوکے (کی ٹٹی) پر دل وار دیتا ہے

۱۳۔ عقل کی روشنی خود ایک خوبصورت جنت ہے — جبکہ روح جسموں کی گرمی سے ایک دوزخ ہے

یہ حمدیہ نظم مولانا فراہیؒ کی ہے، اس کی کوئی داخلی یا خارجی شہادت، سوائے اس کے کہ مولانا کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی مولانا کے اپنے خط میں ہے نیز یہ کہ طرز کلام اور رنگ ان ہی کا ہے، کوئی اور ثبوت موجود نہیں۔ اس کی پشت پر پنسل سے لکھے ہوئے مولانا کے تغیری نوٹ بھی، جن کا ایک خاص انداز ہے اور جو انہی کے ساتھ مخصوص ہیں، یہ گواہی دیتے ہیں کہ اس میں ہر چیز کا تعلق مولانا فراہی سے ہے۔ اس کے علاوہ اس کا محل دریافت اور دوسرے قرائن بھی اس کے حق میں ہیں کہ یہ نظم مولانا فراہیؒ کی ہے۔ یہ نظم ہمیں مولانا فراہیؒ کے عاشق زار مولوی ابوسفیان اصلاحی[1] ساکن موضع بمہور ضلع اعظم گڑھ (یوپی۔ انڈیا) کے ہاں سے ملی جنھوں نے یہ نظم اور مولانا کے متعدد خطوط نہ جانے کب سے سنبھال کے اس لئے رکھے تھے کہ کسی دن فراہیات کا کوئی جویا سوالی بن کر آئے گا اور وہ اس کا دامن گوہر مراد سے بھر دیں گے۔ میں جب ہندوستان گیا تھا اور بستی بستی پھر کر دلدادگانِ فراہی سے ملا تھا کہ ان کے پاس اگر کچھ ہے تو نکال کر میرے حوالہ کریں کہ اس سے بہتر موقع اور مصرف ان کی جمع کی ہوئی دولت کا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ واضح رہے کہ میں ان دنوں مولانا فراہی کی سوانح حیات کے متعلق مواد فراہم کرنے کی مہم پر تھا۔ مولوی ابوسفیان اصلاحی نے خوش ہو کر کچھ نوادرات کی موجودگی کی خوشخبری سنائی مگر مسلسل سعی و کوشش کے باوجود وہ انھیں تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ میں نے ہندوستان سے واپس آنے کے بعد بھی بذریعہ مراسلت ان سے رابطہ رکھا اور انھوں نے تلاش جاری رکھی۔ بالآخر انھیں اپنا کھویا ہوا خزانہ مل گیا اور انھوں نے از راہِ عنایت اپنی وہ دولت میرے حوالہ کر دی جسے انھوں نے دوسروں ہی سے نہیں خود اپنے آپ سے بھی

[1] افسوس کہ اب مرحوم ہو چکے ہیں

چھپا رکھا تھا۔

ذیل میں ہم ابوسفیان اصلاحی صاحب کے خط سے ضروری اجزاء نقل کرتے ہیں۔

"آپ کا مکتوب گرامی ملا۔ تاخیر کے ثمر سے آپ خوش ہو جائیں گے، وہ سب چیزیں جن کی تلاش میں میں سرگرداں تھا الحمد للہ کہ مل گئیں اور آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ان چیزوں کا نہ ملنا میری بے پروائی کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ غیر معمولی احتیاط کی وجہ سے تھا وہاں تک ہاتھ کی رسائی نہیں ہو رہی تھی یعنی میرا غیر معمولی اعتناء اس کی خفا کا باعث بن گیا۔ بہرحال آں عزیز پر تو یہ ظاہر ہی ہو جائیگا کہ میں اپنے مخدوموں و محبوبوں کے ایک ایک نقطہ کے ساتھ محبت نہیں بلکہ عشق رکھتا ہوں مضمون کچھ نہ ہو لیکن ان کے متبرک ہاتھ کا ہو میرے لئے بس اتنا کافی ہے۔ مولانا فراہی کا کارڈ حاجی رشید الدینؒ[1] کے نام، مولانا فراہی کا کارڈ محمد سجاد[2] کے نام، مولانا فراہی کا خط اپنے والد محترم کے نام جب کہ وہ لاہور میں مولانا فیض الحسن[3] صاحب کے یہاں پڑھنے گئے تھے، ان کے ہاتھ کی ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک حمد جو ممکن ہے دیوان حمید میں شائع ہو چکی ہو، میرے پاس اس وقت دیوان حمید نہیں ہے، لیکن مجھ کو تو سروکار ان کے دست مبارک کی تحریر سے ہے، پشت پر قربانِ اسمٰعیل پر کچھ نوٹس ہیں، علامہ شبلی کا خط مولانا فراہی کے نام کہ کسی عہدے کو قبول کر لو، اتریبی کا بینہ خط[4]"

یہ نظم مولانا کے مطبوعہ مجموعہ کلام میں نہیں ہے اس لئے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ابھی تک کہیں چھپی نہیں ہے۔ مطبوعہ دیوان میں "بنام خدا اے ہمہ مہر مہربان" کے عنوان سے اسی طرز کی ایک نظم شامل ہے مگر وہ نظم اور ہے اور یہ نظم اور ہے۔ اس نظم کی ظاہری وضع اور طرز کتابت بھی توجہ کی طالب ہے۔ سادگی اور پرکاری لئے ہوئے مولانا کا سنجیدہ ذوق جمالیات جس طرح اس نظم کے

[1] مولانا کے چھوٹے بھائی [2] مولانا کے بڑے صاحبزادے [3] مولانا کے استاذ محترم [4] خط قلمی بنام شرف الدین اصلاحی

خط پر تاریخ درج نہیں لیکن اتنا طے ہے کہ نومبر دسمبر ۱۹۰۶ء کی کسی تاریخ میں لکھا گیا۔

گیٹ اپ اور حسن کتابت میں ظاہر ہوا ہے اس میں بھی ایک کیفیت ہے اور بار بار نظر دیکھنے کیلئے اس کی طرف اٹھتی ہے۔

مولانا کے سنجیدہ کلام کی طرح اس نظم میں بھی ہمیں قرآنی آیات اور مطالب کی صدائے باز گشت سنائی دیتی ہے۔ بعض شعر اور مصرعے تو قرآنی آیات کا منظوم ترجمہ معلوم ہوتے ہیں مثلاً نظم کا پہلا شعر

بنام آں کہ آغاز ست و پایاں خدائے کاشکارا ہست و پنہاں

قرآن مجید کی اس آیت پر کس طرح مبنی ہے مجرد ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے۔

ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ الخ[1]۔ دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ ع

فروغ آسمانہا و زمین ست

"اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"[2] کی مشہور آیت کا سیدھا سادہ ترجمہ ہے۔

تیسرا شعر ندارد ہیچ ہمتائے نہ مانند نخواہد نیز انبازے نہ فرزند

"لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ"[3] اور پوری سورہ اخلاص کا عکاس ہے۔

چوتھے شعر کا دوسرا مصرعہ ع بہر سوئے کہ رو کردی ہم آنجاست

"فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ"[4] کا آئینہ دار ہے۔

ساتواں شعر چو خاک جان تو گردید ہموار در و تخم خرد افگند یک بار

قرآن مجید میں متعدد آیات اس مضمون کی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی سے انسان کا کالبد تیار کیا اور پھر اس میں اپنی روح پھونکی[5]۔ اس مضمون کا پرتو اس شعر میں صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

وھلم جرا

۱؎ سورہ حدید آیت ۳۔ ۲؎ سورہ نور آیت ۳۵ ۳؎ سورہ شوریٰ آیت ۱۱ ۴؎ سورہ بقرہ آیت ۱۱۵۔

۵؎ سورہ سجدہ آیت ۹، سورہ حجر آیت ۲۹، سورہ ص آیت ۷۲

زبان کی خوبیوں اور شعری محاسن کا جہاں تک تعلق ہے وہ اہل ذوق نظم کے اشعار پر ایک نظر ڈال کر خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جس نظم میں اس طرح کے اشعار ہوں

تن و جان و خرد چوں نردبانیست جہانے و جہانے در جہانیست

اسے ہم مضمون اور طرز ادا کے اعتبار سے معمولی درجے کا کلام نہیں کہہ سکتے۔ لیکن مولانا جس مرتبے کے شاعر تھے ان کی نظر میں یہ نظم غالباً اس قابل نہیں تھی کہ اسے وہ اپنے دیوان میں جگہ دیتے۔ یہ نظم جس حالت میں ملی ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے اسے معیار سے فروتر سمجھ کر غالباً رد کر دیا تھا۔ دیوان میں اس کا شامل نہ ہونا تو امر اتفاقی بھی ہو سکتا ہے مگر اس کی پشت کو معمولی کاغذ کے طور پر تفسیری نوٹ کے لئے استعمال کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ مولانا نے اسے اتنا بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا کہ اسے کسی قابل قدر چیز کی طرح سنبھال کر رکھنے کا اہتمام کرتے۔ اس سے مولانا کے اپنے ذوق اور اس دور کے معیار کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے اور اس سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جس شخص کی رد کی ہوئی نظم اس معیار کی ہے اس کی قبول کی ہوئی نظمیں کس معیار کی ہوں گی۔

مولانا کی فارسی شاعری کس پائے کی ہے اس کے ذکر کا یہ محل نہیں اگرچہ اس پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ بالفعل ہم یہاں ان کی فارسی شاعری اور زبان دانی کے متعلق علامہ شبلیؒ کی رائے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں وہ نواب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کو لکھتے ہیں

"عزیزی مولوی حمید الدین کا کچھ کلام چھاپا گیا ہے، ایک نسخہ ارسال خدمت ہے، اخیر کے دونوں قصیدے ملاحظہ فرمائیے، فارسی زبان اس کا نام ہے"[1]

شعر العجم کا مصنف جس کے بارے میں یہ لکھے اس کے کمال میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔

۱؎ مکاتیب شبلی حصہ اول، ص ۲۴۲، خط نمبر ۲۳ مورخہ ۱۴ مئی سنہ ۱۹۰۰ء

معارف کی ڈاک

(۱)

پیرس ۔ فرانس بسم اللہ ۱۴ محرم ۱۴۰۹ھ

مخدوم و محترم زاد فیضکم، السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

ہفتہ عشرہ ہوگیا، کرم نامہ ملا تھا، عمر کو بہانہ بناؤں تو بھی قصوروار بہرحال ہوں کہ جواب فوراً نہیں دیا، والعذر عند کرام الناس مأمول، معاف فرمادیں۔

آپ کو زحمت دی تھی، دلی شکریہ کہ آپ تصحیح شائع فرمارہے ہیں، ہمارے آثار قلمیہ کی عمر ہم سے زیادہ ہوتی ہے، الا ماشاء اللہ، معارف ایک مستند رسالہ ہے، اس میں سہواً ہی سہی، غلطی ہوئی ہو تو اس کی تصحیح ایک علمی فریضہ ہے، علمی رسالوں کے نئے سے زیادہ پرانے نمبروں سے اہل علم استفادہ کرتے ہیں۔

آپ دیکھ چکے ہیں کہ جب بھی کوئی اپنی دانست میں اہم چیز ذہن میں آتی ہے تو میں معارف ہی کا توسط ڈھونڈتا ہوں، میرے تجربے میں عنوان کام کا تین چوتھائی حصہ ہوتا ہے، مواد کا جمع کرنا بیس فی صد اور تدوین پانچ فی صد، لیکن عنوان حسب طلب ذہن میں نہیں آتا، یہ بہانہ نہیں، حقیقت ہے، اور کیا عرض کروں؟ حفظکم اللہ وعافاکم م ۔ ح ۔ ا

مکرر۔ ان دنوں اتفاقاً دسمبر ۱۹۵۹ء کا معارف ہاتھ میں پڑا، اس میں اس ناچیز کے فرانسیسی ترجمۂ قرآن کی تاریخ بھی[1] ہے، وہ پہلا اڈیشن تھا، آپ کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ اب ۱۹۸۸ء میں الحمد للہ اس کا پندرہواں اڈیشن مطبع میں ہے، اس دفعہ ناشر اس کے ایک لاکھ نسخے نکالنا چاہتا ہے، مانگ بہت ہوگئی ہے، خاص کر سیاہ افریقہ میں۔

---

[1] ان سطروں کی کتابت ہو چکی تھی کہ مکتوب نگار کا اس پر مقالہ بھی آگیا جو ان شاء اللہ آیندہ شمارہ میں شائع ہوگا "معارف"

(۲)

دفتر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۸۸ء
پنجاب یونیورسٹی لاہور،

مکرم و محترم جناب اصلاحی صاحب! السلام علیکم ۔ اگست کا معارف نظر سے گذرا، خوشی کی بات ہے کہ آپ نے سابقہ معیار کو برقرار رکھا ہے، اس شمارے کے تمام مضامین معیاری ہیں۔

اخبار علمیہ کے کالم کا دوبارہ اجراء قابل ستائش ہے، اس میں عربی کی ان کتابوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو آج کل پہلی بار تحقیق و تصحیح، اور تحشیہ سے مزین ہو کر کویت سے لیکر مراکش تک دھڑا دھڑ شائع ہو رہی ہیں، عالم عرب کی علمی رفتار سے واقفیت کے لیے دمشق (شام) کے مشہور عالم سہ ماہی رسالہ مجلہ مجمع اللغۃ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے، مراکش کا دینی و علمی ماہنامہ دعوۃ الحق بھی اس بارے میں معلومات افزا ہے،[1] اس کے علاوہ عرب لیگ کے ثقافتی شعبہ الیسکو (ALESCO) سے بھی ربط و ضبط ضروری ہے،

آپ نے اسی شمارے میں "شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے امتیازی کارناموں" پر ایک مبسوط مقالہ بڑی محنت سے لکھا ہے، لیکن اس میں کہیں کہیں تکرار ہے، اس سے بچنے کے لیے ایجاز و اختصار (EXACTNESS و CONCISENESS) ضروری ہے جو کہ شبلی اسکول کے اسلوب بیان کی امتیازی خصوصیت ہے، اقتباسات اور حوالوں کی کثرت بھی بعض اوقات ذوق سلیم پر گراں گذرتی ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب "مسلمانوں کا نظام تربیت" میں شیخ محدث کے متعلق بعض معلومات مل جاتی ہیں جو شاید آپ کے پیش نظر نہیں رہی، بہرحال ان گذارشات کے لیے معذرت خواہ ہوں، امید ہے کہ آپ برا نہ مانیں گے ۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا، رفقاء کی خدمت میں سلام عرض کریں۔
—— نیازمند (شیخ) نذیر حسین۔

---

[1] یہ دونوں رسالے اگر آپ کے ہاں نہ آتے ہوں تو ان کو معارف کے تبادلہ میں منگا سکتے ہیں، تھوڑی سی کوشش سے علمی اداروں کو مفت بھی مل سکتے ہیں۔

ادبیات

ترا نام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم

خیر البشر لقب ترا، خیر الانام تو
ایماں ہے جو مرا، وہ خدا کا کلام تو
تو دانش اعتبار، بصیرت مقام تو

تو ذہن، تو نظر، کہ ترا نام مصطفےٰ

روشن ترے ہنر سے در و بام کائنات
پرتو سے تیرے آئنہ، ظلماتِ شش جہات
پُرمایہ تجھ سے جیب صدف دامنِ حیات

تو بارشِ گہر، کہ ترا نام مصطفےٰ

نقشِ قدم ہے سینۂ آفاق پہ ترا
آخر پڑاؤ تھا شبِ اسریٰ کدھر ترا
جبریل ہم سفر تھے، عجب تھا سفر ترا

تو دل کی رہ گزر، کہ ترا نام مصطفےٰ

کوثر کا لطف، تیری نگاہِ حرم نواز
دستِ قمر شگاف ترا روشنی کا ساز
وہ تیرے قلبِ پاک کا سوز و گداز

تو شمع، تو سحر، کہ ترا نام مصطفےٰ

تیرے نفس کی موج، ندا جبرئیل کی
تو وحی، روانی و روش سلسبیل کی
عیسیٰؑ کی پیش گفت، بشارت خلیلؑ کی

تو ذکر، تو خبر، کہ ترا نام مصطفےٰ

تو فخرِ کائنات، تو اللہ کا حبیب
رحمت نے اس کی تجھ کو کیا عرش کے قریب
اس خاکداں میں جز ترے کس کو ہوا نصیب

معراج کا سفر، کہ ترا نام مصطفےٰ

تو آبرو ہے، کعبۂ جاں کے غلاف کی
تو چاندنی ہے، شامِ سوادِ طواف کی
تو نے حقیقتِ ابدی واشگاف کی

حق بین و حق نگر، کہ ترا نام مصطفےٰ

بے چین زندگی کو تھا صدیوں سے انتظار
تو نے سنواری زلفِ پریشانِ روزگار
تجھ سے ملے حیات و تمدن کو برگ و بار

تو مژدۂ ظفر، کہ ترا نام مصطفےٰ

حکمت سے تیری، طالعِ لعل و گہر بلند
انسانیت ہے اوج پر انسان سر بلند
دل مطمئن، دماغ شگفتہ، نظر بلند

تو حکمت و ہنر، کہ ترا نام مصطفےٰ

مذہب کا شعور، سیاست کا فلسفہ

تہذیب کا اصول، معیشت کا فلسفہ

تعلیم تیری، خیر و سعادت کا فلسفہ

تو گنجِ بحر و بر، کہ ترا نام مصطفیٰؐ

پیمانۂ جراحت و مرہم بدل گیا

قانونِ چارہ سازیِ عالم بدل گیا

گل تو اک کائنات کا موسم بدل گیا

تو پھول، تو ثمر، کہ ترا نام مصطفیٰؐ

ناقص ہے دو جہاں کی قیادت ترے بغیر

تشنہ ہے ہر نظامِ شریعت ترے بغیر

ممکن نہیں فلاح کی صورت ترے بغیر

تو میرا راہ بر، کہ ترا نام مصطفیٰؐ

چشمِ ملائکہ میں ہے خوابِ رواں مرا

ہجرت کی منزلوں میں ہے پھر کارواں مرا

تو زندگی کی دھوپ میں ہے سائباں مرا

تو سایہ تو شجر کہ ترا نام مصطفیٰؐ

مطبوعات جدیدہ

تفسیر سورۃ النور: تالیف شیخ الاسلام ابو العباس تقی الدین احمد بن عبد الحلیم ابن تیمیہ الحرانی، تقطیع کلاں، کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۲۴۴، قیمت تحریر نہیں، پتہ: الدار السلفیہ ۸/۶ ای. حضرت تیرس، شیخ حفیظ الدین روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۸۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کے علمی آثار و باقیات میں سورۂ نور کی تفسیر بھی ہے، گو انھوں نے اس سورہ کی کوئی مستقل تفسیر نہیں لکھی تھی، بلکہ بعض استفسارات کے جواب میں اس سورہ کے مباحث و مسائل پر جو کچھ تحریر فرمایا تھا اسے ان کے مجموعۂ فتاویٰ سے الگ کر کے عرصہ ہوا مصر سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا تھا، اب وہ نسخہ کمیاب ہے، اس لیے الدار السلفیہ نے تصحیح و مراجعت کے بعد اسے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے، اس کے قیام کا مقصد ہی اسلاف خصوصاً شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کے علمی آثار اور یادگاروں کی طبع و اشاعت ہے، چنانچہ اس نے اپنے نئے اشاعتی پروگرام کا آغاز شیخ کی تفسیر سورۂ اخلاص کی اشاعت سے کیا تھا، اور اب ان کی یہ تفسیر شائع کی ہے، اس میں سورہ میں بیان کیے گئے مسائل و احکام زنا، قذف، فاحشہ، شہادت، پردہ اور اسمائے حسنیٰ وغیرہ سے متعلق آیات کی تفسیر و تشریح کے ضمن میں مصنف علام نے اپنے مالوف طریقہ کے مطابق بڑے اہم حقائق و دقائق بیان کیے ہیں اور ہر ہر مسئلہ کے گوناگوں پہلوؤں کو شرح و بسط کے ساتھ واضح کیا ہے، ڈاکٹر عبد العلی کی تحقیق و تحشیہ سے اس کا فائدہ دوچند ہو گیا ہے، انھوں نے

مقدمہ میں سورۂ نور کی اہمیت اور اس کے نزول کا پس منظر بیان کیا ہے؛ اور اس کے مضامین کا تجزیہ کر کے ان کی تشریح کی ہے، لائق محقق نے مطبوعہ نسخہ کے بعض اغلاط کی تصحیح بھی کی ہے، اور آخر میں مراجع ومضامین کی دو فہرستیں دی ہیں، حسن طباعت کے لیے الدار السلفیۃ اور اس کے سربراہ مولانا مختار احمد ندوی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

الجامع لشعب الإیمان (الجزء السادس) } تالیف امام حافظ ابوبکر احمد بن حسین بیہقی، تقطیع کلاں، کاغذ وطباعت عمدہ

صفحات ۵۷۶، مجلد پتہ: ایضاً۔

اس کتاب کی ابتدائی چند جلدوں کا ذکر ان صفحات میں پہلے آچکا ہے، یہ اس کا چھٹا حصہ ہے جس کو پہلے حصوں کی طرح بہت نفاست اور خوبصورتی سے شائع کیا گیا ہے، اس حصہ میں امام بیہقیؒ نے ایمان کے ستر سے زائد شعبوں میں سے بیسویں، اکیسویں اور بائیسویں شعبوں کا ذکر کیا ہے جو بالترتیب طہارت، صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے ابواب پر مشتمل ہیں، کتاب کے متن کی تصحیح ومراجعت آیات واحادیث کی تخریج اور تحقیق وتحشیہ کا کام ڈاکٹر عبد العلی نے محنت وجستجو سے انجام دیا ہے، اس کے لیے اہل علم کو ان کا اور حسن طباعت کے لیے مولانا مختار احمد ندوی کا ممنون ہونا چاہیے۔

تذکرۂ مشاہیر کوپاگنج: مرتبہ مولانا محمد عثمان معروفی اعظمی وابو الکلام جوہر ندوی صاحبان،

تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۶۰، پتہ محمد عثمان معروفی مدرسہ جامع العلوم کوپاگنج اعظم گڈھ

اعظم گڈھ کے قصبات مردم خیزی کے لیے ہمیشہ سے ممتاز رہے ہیں، کوپاگنج بھی اعظم گڈھ کا ایک مشہور صنعتی قصبہ ہے، اس کتاب میں اس کے اور اس کے قرب وجوار کے مختلف مذاہب کے تقریباً چالیس علماء ومشائخ کے مختصر حالات تحریر کیے گئے ہیں؛ شروع میں قصبہ کی مختصر تاریخ بھی قلمبند کی گئی ہے جس میں یہاں کی مساجد مدارس اور دوسری تاریخی اور متبرک جگہوں کا ذکر ہے۔

"ض"

جلد ۱۴۲ ماہ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۸۸ء عدد ۵

مضامین